

طغرل نے اس آئینے میں پہلے اپنے آپ کو دیکھا پھر اپنے عقب میں آئے شیردل اور عکس کو دیکھا۔ اسے وہاں رکے دیکھ کر شیردل بھی وہاں چند لمحوں کے لیے رک گیا تھا۔ عکس نے پلٹ کر ایک بار پھر باذل کا ہاتھ پکڑ لیا جس نے بڑی مہارت سے گاڑی سے نکل کر یہاں برآمدے میں آنے تک چند قدموں کے فاصلے میں دو بار اس سے اپنا ہاتھ جھڑپا تھا۔ اس پر قابو پانا صرف اسی کا کمال تھا۔

”تمہیں پتا ہے میں نے تمہاری می کو پہلی بار کہاں دیکھا تھا؟“ عکس نے آئینے کے سامنے کھڑے شیردل کو طغرل سے کہتے سنا۔

”کہاں پایا؟“ طغرل نے بڑی دلچسپی سے گردن موڑ کر باپ کو دیکھا۔

”اسی گھر میں۔“ عکس کی نظریں آئینے میں شیردل سے ملی تھیں۔ ان آنکھوں میں شیردل کو حیرانی نظر آئی۔ وہ مسکرایا تھا اور وہ حیرانی پل بھر میں ایک ہلکے صلابت میں بدل گئی تھی۔ عکس ہنس پڑی تھی۔ اسے یاد آ گیا تھا شیردل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے پہلی بار اسے اسی آئینے میں دیکھا تھا جب وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹینس شائس کی پریکٹس کرتا تھا اور وہ برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے چھپی اسے دیکھتی رہتی تھی..... کسی میکانیکی انداز میں اس نے بے اختیار گردن موڑ کر اس ستون کو دیکھا تھا۔ ستون اب بھی وہیں تھا لیکن اس کے گرد وہ تیل نہیں تھی شاید نمی کے اثرات کو روکنے کے لیے ان تمام بیلوں کو ستونوں اور دیواروں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تھا جو کئی سال پہلے اس گھر کی شناخت تھیں۔ عکس نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ گھر بہت بدل گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی ایک، ایک چیز کو آج بھی آنکھیں بند کیے چھو کر بھی پہچان سکتی تھی۔ وقت زندگی کو کس طرح بہا کر لے جاتا ہے کہ انسان خود بھی اسے روکنے بیٹھے تو روک نہ سکے..... گزر جانے والے لمحوں کو گننے بیٹھے تو کتنی بھول جائے۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ نو سالہ طغرل نے پہلے اُلجھ کر پھر ہنس کر اسی آئینے میں دیکھتے ہوئے شیردل سے کہا۔ اس کے تبصرے نے عکس کی توجہ ایک بار پھر اپنی طرف مبذول کی۔

”کیوں؟“ شیردل نے طغرل سے پوچھا۔

”ممی اس مرر میں کیسے ہو سکتی ہیں؟“ طغرل نے جیسے اپنی بے یقینی کی وضاحت کی۔

”دیکھو ابھی ہیں یا نہیں؟“ شیردل نے اس کی وضاحت کے جواب میں آئینے میں نظر آتی عکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔ طغرل نے آئینے میں عکس کو دیکھا۔ باپ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی آئینے میں تھی۔ طغرل اُلجھا پھر ہنس پڑا۔

”پاپا یہ تو ان کا reflection ہے۔“ اس نے جیسے شیردل کی کم علمی بتائی۔

”یعنی عکس ہے۔“ شیردل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عکس تب تک ان کے قریب آ چکی تھی۔ اس نے شیردل کے کندھے کو ہولے سے چھوتے ہوئے کہا۔ ”تم بس کر جواب..... کب تک اس بے چارے کو تنگ کرتے رہو گے۔ ذرا اسے سنبھالو تو پھر پتا چلے۔“ اس نے باذل کا ہاتھ شیردل کے ہاتھ میں دے دیا۔

شیردل نے ایک نظر سات سالہ باذل کو دیکھا پھر جیسے کچھ احتجاجی انداز میں عکس سے کہا۔ ”تم ہمیشہ مجھے مشکل چیلنج دیتی ہو۔“

”تم ہر آسان چیلنج کو بھی مشکل بنا لیتے ہو اپنے لیے۔“ وہ اطمینان سے کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی تھی۔ آج اس

آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اس آئینے میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ کسی اور چیز کو کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تلاش کئی سال پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔

”پاپا! آپ کیا مجھے اٹھا سکتے ہیں؟“ شیردل کے ساتھ اندرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے باذل کے قدم تھے اور اس نے بڑی معصومیت سے شیردل سے پوچھا۔

”میں اٹھا سکتا ہوں لیکن اٹھاؤں گا نہیں۔“ شیردل نے اُسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”مُمی اٹھا سکتی ہیں مجھے۔“ باذل نے جیسے باپ کی مردانگی کو چیلنج دیا جسے شیردل نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ نظر انداز کیا۔ عکس بڑی خاموشی کے ساتھ باپ بیٹے کی گفتگو سنتے ہوئے اندر کی جانب بڑھتی رہی۔

”تمہاری مُمی اس گھر میں dwarfs (بونے) دیکھا کرتی تھیں جب وہ چھوٹی تھیں۔“ شیردل نے چلتے چلتے ایک دم جیسے کچھ یاد آنے پر طفرل کو بتایا۔

”Really mummy?“ طفرل چلتے چلتے بے یقینی کے عالم میں رک کر عکس کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی ٹھٹک گئی تھی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

”dwarfs..... بونے..... آئینہ.....“ شیردل نے اسے کیا یاد دلایا تھا۔ اسے وہ سات ساتھی بونے بھی یاد آ گئے تھے۔ اس کے تصوراتی دوست..... لیکن جس برق رفتاری سے وہ یاد آئے تھے اسی برق رفتاری سے ان کے حلیے، حرکتیں اور نام یاد نہیں آئے تھے..... اس میں وقت لگا تھا..... اس میں اگلے دو دن لگ گئے تھے۔

”پاپا مذاق کر رہے تھے۔“ عکس نے مدہم انداز میں طفرل کی حیران آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ شیردل نے..... پلٹ کر جیسے پُر حیرت نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں مذاق کر رہا ہوں؟ تم نے خود ہی تو مجھے بتایا تھا ایک بار کہ تم نے یہاں.....“ عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

”بچپن کی بات تھی وہ اور بچپن میں انسان کو پتا نہیں کیا کیا وہم ہوتے رہتے ہیں۔“ وہ بڑی سہولت سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تھی۔ شیردل نے کچھ حیرانی سے اسے جاتے دیکھا۔

”پاپا، مُمی نے really ہی dwarfs دیکھے تھے یہاں؟“ طفرل کا تجسس کم نہیں ہوا تھا۔

”اپنی مُمی سے پوچھنا، وہ آپ کو بتائیں گی۔“ شیردل بھی اسے ٹالتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

اس گھر میں عکس مراد علی کی وہ دوسری پوسٹنگ تھی۔ پورے دس سال کے بعد..... لیکن اس بار وہ وہاں کمشنر کی حیثیت سے آئی تھی۔ اس شہر کو ڈویژن کا درجہ حاصل ہو جانے کے بعد وہاں تعینات ہونے والی پہلی کمشنر..... کمشنر کی رہائش گاہ زیر تعمیر تھی اور اس کے زیر تعمیر ہونے کی وجہ سے ڈپٹی کمشنر کی سرکاری رہائش گاہ کو وقتی طور پر کمشنر ہاؤس کا سرکاری درجہ دے دیا گیا تھا۔ گھر میں سامان کی شفٹنگ کا کام پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا لیکن یہ کام شیردل کی نگرانی میں ہوا تھا۔ وہ آج پوسٹ ہونے کے بعد پہلی بار اس گھر میں آئی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ دس سال پہلے ہونے والی یہاں اپنی پہلی پوسٹنگ کی طرح وہ آج اس طرح جذباتی نہیں ہوئی تھی نہ ہی اتنی ایکساٹنڈ تھی..... شاید اس لیے کیونکہ اس کے نانا اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اس بار وہ ایک قلعہ فتح کرنے وہاں نہیں آئی تھی۔

اس گھر کے ہال کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عکس مراد علی نے عجیب سی اداسی محسوس کی۔ نانا اسے ایک بار

عکس

پھر مئی طرح یاد آنے لگے تھے۔ وہ آج ایک بار پھر اسے اس گھر میں کمشنر کے طور پر آتے دیکھتے تو بے حد خوش ہوتے۔ بہت سارے خواب صرف ان کے تھے اس کے حوالے سے..... جو صرف وہ دیکھتے تھے اور ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد عکس مراد علی کے نزدیک کامیابی کا مفہوم وہ نہیں رہا تھا جو نانا کی زندگی میں تھا۔

ہال کمرے میں کھڑی ان درود یوار کو اداسی سے دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چوکی تھی۔ شیر دل نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلا یا تھا۔ وہ اب اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ اس لمس میں عجیب دلگیری تھی، کچھ کہے اور سنے بغیر بھی جیسے دنیا جہان کی گفتگو تھی..... ہر مرہم بننے والا پھایا محسوس ہونے والا لفظ.....

ساری عمر وہ دونوں ایک دوسرے کی خاموشی کو اسی طرح پڑھتے رہے..... لفظوں کے بغیر..... اداسی کو بیرومیٹر کی طرح بھانپ لیتے تھے اور خفگی کو راڈ کی طرح..... اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

عکس مراد علی نے ایک شیر دل کے چہرے کو گردن موڑ کر دیکھا۔ اس نے اس کی نظریں محسوس کرتے ہی جیسے بڑی حیرانی سے اس سے کہا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ مسکرا دی۔ اس نے اس کے گال پر نظر آنے والے پلک کے ایک بال کو انگلیوں کی پوروں کی غیر محسوس حرکت سے ہٹایا تھا۔ زندگی میں ایسا جیون سا تھی بہت خوش قسمت عورتوں کے حصے میں آتا تھا۔ عکس مراد علی نے وہاں کھڑے چند لمحوں کے لیے جیسے عجیب تعجب سے سوچا۔ اس گھر میں اپنا بچپن گزارتے ہوئے اس نے جتنی بھی خواہشیں کبھی کی تھیں وہ تمام پوری ہوئی تھیں اور اس بات کا ادراک اسے عجیب وقت پر ہوا تھا۔ یہ گھر خوش قسمتی اور بد قسمتی کا عجیب امتزاج لیے ہوئے تھا اس کے لیے۔



شرمین اور فاروق نے شہر بانو کو انر پورٹ پر ریسو کیا تھا لیکن دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ شہر بانو نے بے حد تھکے ہوئے انداز میں مثال کو ماں کو پکڑا دیا تھا۔ وہ مثال کو بہلانے پھسلانے یا ڈرانے کسی بھی چیز میں پورا راستہ کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اب شرمین کی صورت میں اسے جیسے کچھ دیر کے لیے اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے ایک اور کندھا مل گیا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ مثال شرمین سے بھی بہلنے والی نہیں تھی۔ ایک بچے کے طور پر بھی وہ صورت حال کی سنگینی کو بھانپ گئی تھی۔ وہ چند ہفتے پہلے والی مثال نہیں تھی جو خوشی خوشی امریکا اپنی نانی اور نانا کے پاس چھٹیاں گزارنے آئی تھی اور انر پورٹ سے لے کر گھر تک شرمین کو پتا نہیں کیا کیا قصے سناتی رہی تھی۔ اس بار مثال، شرمین کی بے تحاشا کوششوں کے باوجود صرف اس ایک جملے کے ہوا کچھ بولنے پر تیار نہیں تھی کہ اسے پاپا کے پاس جانا ہے۔ وہ پاپ کو مرس کر رہی تھی۔ فاروق خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے رہے تھے۔ شہر بانو ان کے برابر والی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے اس خوفناک خواب کے بارے میں سوچتی رہی تھی جو اس نے حقیقت میں دیکھا تھا۔ عقبی نشست پر شرمین، مثال کو لیے بیٹھی کسی طرح اس کو بہلانے کی کوششوں میں مصروف تھیں اور ہر بار اس کے منہ سے نکلنے والے جملے شہر بانو کے اعصاب پر جیسے ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ وہ مثال کو اپنی ”ساری فیملی“ سمجھ کر سمیٹ لائی تھی اور مثال کی ساری فیملی سمٹ کر جیسے شیر دل کی ذات پر آ کر ٹھہر گئی تھی..... تو وہ..... خود وہ شہر بانو کہاں کھڑی تھی۔

اگلے دو دن شہر بانو اور شرمین کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن شرمین اسے یہ ضرور بتاتی رہی تھیں کہ

پاکستان سے کس کس کا کتنی کتنی بار فون آیا تھا اور امریکا میں ان کے کس کس رشتے دار نے شیردل کی فیملی کے دباؤ پر ان سے رابطہ کیا تھا۔ شہر بانو نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے عجیب گم صم سی حالت میں تھی۔ عجیب سونی جاگتی کیفیت جس میں وہ اپنی زندگی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو بار بار رکھ کر جوڑنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی جا رہی تھی کہ شاید کسی طرح وہ اس سارے معصے کا کوئی حل، کوئی شکل نکال پاتی..... ہر بار وہ ناکام رہی۔ مثال کی حالت اب بھی ویسی ہی تھی صرف اب اگر کوئی فرق پڑا تھا تو یہ کہ وہ ہر وقت روتی نہیں رہتی تھی لیکن وہ بھی شہر بانو کی طرح کوئی کھلونا پکڑے کسی کو نے میں بیٹھی رہتی پھر یک دم کسی بات پر ضد شروع کر دیتی اور پھر کتنی کتنی دیر بیٹھ کر روتی رہتی۔ شہر بانو عجیب میکانیکی انداز میں اسے روتا دیکھتی رہتی۔ اسے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ مثال کے اس طرح رونے کو اتنی سرد مہری کے ساتھ نظر انداز کر سکتی تھی، اس کی چیخ و پکار کے سامنے اس طرح بے حس ہو سکتی تھی لیکن وہ ہو گئی تھی۔ انسان بعض دفعہ اپنی ذات کے بہت سے پہلوؤں سے اس وقت آگاہ ہوتا ہے جب دوسرے اسے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا اس سے واسطہ پڑ جاتا ہے وہ اس پر بات کرنے لگتے ہیں اور تب انسان جیسے شاک کے عالم میں اپنی ذات کے اس پہلو کو دیکھتا ہے۔ حیران ہوتا ہے..... میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں ایسا کس طرح ہو سکتا ہوں؟ لیکن سارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ سوال بہت سارے ہوتے ہیں جواب نہیں..... جواب بس ایک ہوتا ہے..... اور وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا..... شہر بانو کو بھی نہیں مل پاتا تھا۔

”اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“ دو دن کے بعد بالآخر شرمین نے ایک رات اس سے اس موضوع پر بات کی۔ وہ کچن صاف کر رہی تھیں اور وہ کچن کاؤنٹر کے سامنے پڑے اسٹول پر کافی کالگ لیے بیٹھی تھی۔

”پتا نہیں۔“ شرمین کو پتا تھا وہ کیا کہے گی۔ وہ بھی اس کے قریب کاؤنٹر کے دوسری طرف اسٹول پر آ کر بیٹھ گئیں۔

”تم شیردل کے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟“ انہوں نے بالآخر ایک لمبی خاموشی کے بعد کہا۔

”نہیں۔“ جواب کسی توقف کے بغیر آیا تھا۔

”divorce چاہتی ہو؟“ شرمین نے اگلا سوال کیا۔

”شاید۔“ جواب اس بار بھی جلدی آیا تھا لیکن الجھن لیے ہوئے تھا اور الجھن کیوں تھی، شہر بانو کے پاس اس بات کا بھی جواب نہیں تھا۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ شہر بانو نے یک دم ماں سے پوچھا۔ شرمین اس کے سوال پر جیسے کچھ حیران ہوئی تھیں۔ شہر بانو نے زندگی میں بہت کم اہم فیصلے کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔ شیردل سے شادی کے وقت بھی اس نے ماں سے مشورہ نہیں کیا تھا صرف اپنی خواہش اور فیصلہ انہیں بتایا تھا اور پھر ان کے مخالف دلائل کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی تھی۔

”تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تم کیا چاہتی ہو؟ مثال کے لیے کیا بہتر ہے؟“ شرمین نے نپے ٹٹے انداز میں اس سے کہا۔

”آپ میری جگہ ہوتیں تو آپ کیا کرتیں؟“ اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ شرمین اس کا چہرہ دیکھنے لگیں پھر انہوں نے کہا۔

”میرے لیے کسی بھی ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہوتا جو مجھ سے وفادار نہیں جو ایک دوسری عورت

کے ساتھ انوالوڈ ہو۔“ کسی دوسرے کی زبان سے شیردل کی فردِ جرم کا سن کر اسے نہ چاہنے کے باوجود عجیب سی تحریف ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اب بھی ہوئی تھی اور شاید ساری عمر ہونے والی تھی۔۔۔۔۔ یہ کانٹال میں گڑا تھا ایڑھی میں چبھا ہوتا تو نکل جاتا۔

”میں بھی نہیں رہ سکتی۔“ اس نے کافی گامگ کاؤنٹر پر گھماتے ہوئے شرین سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ شیردل اور اس کی بے وفائی اور اس کا کردار ڈسکس کرنا ان دونوں کے لیے آسان تھا۔۔۔۔۔ جو چیز دونوں کے لیے مشکل تھی وہ شہباز حسین کو ڈسکس کرنا تھا۔ وہ چڑیا کے ساتھ ہونے والے اس واقعے کو ڈسکس کرنا تھا۔ شیردل کی بے وفائی نے جیسے شہباز حسین کو مزید ذلیل و خوار ہونے اور اپنی اولاد کی نظروں میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ وہ دونوں دن رات شہباز حسین اور عکس اور ان تمام الزامات کے بارے میں سوچتے رہنے کے باوجود اس پر بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ شرین، شہر بانو سے نہ شہر بانو شرین سے۔۔۔۔۔ شہباز حسین بُرا تھا اور شیردل بھی بُرا ہی نکلا کیونکہ وہ بھی اسی خاندان کا مرد تھا۔۔۔۔۔ شرین کا نتیجہ اس کے اندیشوں کے مطابق ہی نکلا تھا لیکن وہ کوشش کرنے اور خواہش ہونے کے باوجود شہر بانو کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی تھیں۔ شیردل اور عکس کے درمیان موجود غیر اخلاقی تعلقات کو ایک فون کال کی وجہ سے وہ بہت پہلے جان گئی تھیں۔ وہ شہر بانو کی اذیت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

دونوں میں سے کسی نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ بس خاموشی سے وہ دونوں اسی طرح کچن کاؤنٹر کے اطراف اسٹول پر بیٹھی چپ چاپ کافی پیتی رہیں۔ اس کی کڑواہٹ زندگی کی کڑواہٹ کے مقابلے میں شیریں بن گئی تھی۔

☆☆☆

شیردل نے زندگی میں کبھی سونے کے لیے خواب آور ادویات کا استعمال نہیں کیا تھا لیکن شہر بانو اور مثال کے اس طرح گھر سے چلے جانے کے بعد وہ دوراتیں نہیں سوسکا تھا۔ سگریٹ پھونکنے، کالز پر کالز ملانے کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ آہستہ آہستہ insomnia (بے خوابی) کا مریض بننے والا تھا۔ اس کی زندگی سے گھر اور سکون نام کی چیزیں جیسے منٹوں میں نکل گئی تھیں اور اس کی ذمے دار شہر بانو تھی۔ اس کے اقدام سے ملنے والا ابتدائی شک اب شدید غصے میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس غصے کو شہر بانو پر نکالنے کے لیے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ شہر بانو جلتی پر تیل چھڑکنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنے والی تھی۔

بختیار شیردل نے شہر بانو کے ساتھ رابطہ کرنے میں ناکام ہو جانے اور شرین کے ساتھ بار بار ہونے والی بات چیت کا کوئی نتیجہ نہ نکلنے پر بالآخر امریکا جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس معاملے کو طول دے کر اس کی سنگینی میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے منترہ اور شیردل کے ساتھ اپنی سیٹ ایئر جنسی میں بیک کروائی تھی لیکن اس واقعے کے چوتھے دن وہ جب شام کو نیویارک کی فلائٹ لینے کے لیے ائر پورٹ پہنچے تو امیگریشن کاؤنٹر پر شیردل کے پاسپورٹ کو ہاتھ میں لیتے اور کمپیوٹر پر چند ثن دباتے ہی امیگریشن اہلکار نے شیردل کو امریکن ایمبیسی کی طرف سے اس کے پانچ سالہ ملٹی پل ویزے کی منسوخی کی اطلاع اسے دے کر پاسپورٹ واپس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ شیردل کا رنگ سیکنڈ میں فق ہوا تھا۔ وہ پاسپورٹ پکڑے بغیر بے یقینی سے اس اہلکار کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مثال سے ملنے اور اسے دیکھ پانے کی ایک آخری امید بھی پل میں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ اس واقعے کے بعد اس کا ویزا کنسل کیا جاسکتا تھا اور وہ بھی انفارم کیے بغیر۔۔۔۔۔ اس کا ذہن جیسے ایک عجیب سے بلیک آؤٹ کا شکار ہوا

تھا۔ غصے، بے بسی اور ناامیدی کی ایک عجیب سی کیفیت..... ایک عجیب جنون خیز کیفیت..... اگر زندگی میں وہ کسی عورت کی دوبارہ شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا تو وہ شہر بانو تھی۔

خوش قسمتی سے بختیار اور منترہ کے ویزے کینسل نہیں ہوئے تھے اور شیردل کے ویزے کے کینسل ہونے پر بہت آپ سیٹ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے سفر کو ملتوی کرنے کے بجائے اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ منترہ اس ساری صورت حال میں بالکل چپ سادھے ہوئے تھیں۔ وہ اس ساری صورت حال کا لمبا کسی کے سر ڈالنا چاہتی تھیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہر بار ایسی کسی کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہی تھیں۔ بختیار اور شیردل نہ بھی کہتے..... کوئی بھی نہ کہتا تو بھی وہ جانتی تھیں یہ ساری تباہی ان کی وجہ سے آئی تھی۔ شیردل کا گھر ان کے علاوہ کسی اور کی وجہ سے نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ شرمین اور شہباز کا گھر بھی انہی کی ضد، جھوٹ اور شہباز کی بے جا اور بے وقت کی طرف داری سے ٹوٹا تھا لیکن وہ بھائی تھا ان کا گھر ٹوٹنے کے بعد انہوں نے کبھی ایسی صورت حال میں اپنے کردار کو analyze نہیں کیا تھا نہ ہی کسی نے ان کے اوپر انگلیاں اٹھائی تھیں۔ وہ ساری عمر اسی ایک بات پر فخر کرتی رہی تھیں کہ ان سے جس حد تک ممکن تھا انہوں نے شہباز کی حمایت کی تھی اور اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔

ایک شیردل کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس میں دنوں میں ان کے جھوٹ کھل کر سامنے آ گئے تھے اور انہیں ایک اور شوہر کے ساتھ ساتھ اپنی دوسری اولاد کے سامنے بھی خفت اٹھانی پڑ رہی تھی۔ ان کی تنقید اور خفگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ شیردل کی حالت دیکھ رہی تھیں اور ایک ماں کے طور پر ان کا دل اس کی حالت پر کٹ رہا تھا لیکن جو ندامت اور غصہ انہیں اپنے آپ پر آنا چاہیے تھا، وہ شہر بانو اور شرمین پر آ رہا تھا۔ شہر بانو سے بھی زیادہ شرمین پر کیونکہ کہیں نہ کہیں انہوں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلایا تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا تھا شرمین کی وجہ سے ہو رہا تھا ان کی برین واشنگ کی وجہ سے..... وہ ان کے خاندان سے بدلہ لینا چاہ رہی تھیں اور وہ اتنے سالوں بعد کامیاب ہو گئی تھیں۔ وہ امریکا بھی انہی شکوک و شبہات، غلط فہمیوں کے ساتھ پہنچی تھیں اور ان کی خفگی اور غصے میں اس وقت اضافہ ہو گیا تھا جب شرمین نے انہیں اپنے گھر بلانے یا شہر بانو سے کہیں بھی ان کی ملاقات کروادینے سے انکار کر دیا تھا۔ بختیار شیردل ان کے ساتھ نہ ہوتے تو منترہ ایک بار پھر غصے میں کوئی مزید ہنگامہ کرتیں لیکن بختیار نے اس معاملے پر شرمین کے میاں فاروق سے بات کر کے انہیں کسی نہ کسی طرح شہر بانو کے ساتھ ایک ملاقات کروانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ فاروق نے شرمین اور شہر بانو کو اس ملاقات پر کیسے تیار کیا تھا وہ ایک الگ کہانی تھی لیکن شہر بانو اور شرمین بالآخر ان لوگوں سے ملاقات پر آمادہ ہو گئی تھیں اور بختیار نے یہ خبر شیردل کو پاکستان میں بھی پہنچا دی تھی۔

☆☆☆

”سجاد قادر“ عکس نے حلیمہ کے نام بتانے پر وہ نام دُہرا کر جیسے اپنی یادداشت تازہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک دُبلے پتلے سانولے رنگ کے لڑکے کا تصور ابھرا تھا لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

”میں نام سے واقف ہوں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی، مجھے شکل تک ٹھیک سے یاد نہیں اس کی۔“ اس نے حلیمہ سے کہا۔

”اچھا؟ لیکن اس کو تو بڑی اچھی طرح سے یاد ہو تم۔“ حلیمہ کو اس کی بات پر جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ ”لیکن خیر یہ تو ایسا کوئی بڑا مسئلہ نہیں، میں ان لوگوں سے بات کر کے ملاقات کروادیتی ہوں تم دونوں کی۔“ حلیمہ نے اس سے کہا۔

”ای وہ دبی میں کام کرتا ہے، میں یہاں پاکستان میں..... اور میرا اپنی جاب چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔“

عکس نے دو ٹوک انداز میں حلیمہ کو اپنی ترجیحات بتادی تھیں۔

”میں نے یہ بھی بات کی تھی ان لوگوں سے..... سجاد نے ایک دو سال تک واپس پاکستان آ جانا ہے۔ یہاں بے ایچے ہاسپٹل سے آفرز ہیں اسے..... لیکن وہ شاید اپنا ہاسپٹل بنانا چاہتا ہے لاہور میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کے..... وہ بھی ڈاکٹر ہے۔“ حلیمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ ملاقات کروادیں۔“ وہ کہہ کر حلیمہ کے پاس سے اٹھ گئی۔ شادی یک دم اسے ایک بوجھ محسوس ہونے لگی تھی۔ خاص طور پر ان اوپر نیچے بار بار ہونے والے حادثات کی وجہ سے..... ایک بار پھر سے کسی نئے آدمی سے ملنا کسی نئے آدمی کو جیون ساتھی کے طور پر دیکھنے کے لیے ملنا..... اپنے ذہن اور دل میں اس کے لیے گنجائش یا کوئی نرم جگہ نہ ہونے کے باوجود پیدا کرنے کی جدوجہد..... عکس مراد علی کہیں نہ کہیں اس ساری جدوجہد سے تنگ آ گئی تھی۔ اگر خیر دین اور حلیمہ کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ کم از کم اس وقت پھر سے کسی نئے شخص سے ملنے کی کوشش نہ کر رہی ہوتی۔

اگلی صبح آفس میں آتے ہی اسے شیردل کی چھٹی کی اطلاع ملی تھی۔ وہ ایک مہینے کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اسے یک دم اس کے حوالے سے مزید تشویش ہوئی تھی۔ بہت دیر تک وہ اس الجھن میں رہی تھی کہ اسے شیردل سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر جیسے اس نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ اس کے موبائل پر کی جانے والی کال بے مقصد ثابت ہوئی تھی۔ اس کے دونوں نمبرز آف تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اس نے اپنے پی اے کو شیردل کی رہائش گاہ پر اس کی موجودگی چیک کرنے اور اس کے موجود ہونے پر اس سے رابطہ کرانے کی ہدایات دی تھیں۔ پی اے کے جواب کے انتظار میں وہ اپنی میز پر پڑے ہوئے وہ تمام Invitation دیکھنے لگی جو شہر کی مختلف تنظیموں اور اداروں کی طرف سے مختلف تقریبات کی صدارت کے لیے اس کے پاس آتے رہے تھے۔ ٹرے میں پڑا وہ چوتھا کارڈ تھا جس کو ہاتھ میں لیتے ہی وہ رک گئی تھی۔ وہ اس کے اپنے کاننٹ اسکول کی طرف سے تھا..... سالانہ اسپورٹس ڈے کے انعقاد اور اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر اس کی شرکت کی دعوت..... اس نے سیکنڈز میں کارڈ پر لکھی تحریر پڑھی تھی اور پھر ایک نام پر رک گئی تھی۔ وہ اسکول کی پرنسپل سسٹر ایلیکس فرانس کا نام تھا۔ وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ ان کا نام زرب لب دہرانے لگی۔ وہ ایک بار پھر اس کے اسکول کی پرنسپل کے طور پر وہاں موجود تھیں۔ اتنے سال گزر گئے تھے اور اتنے سالوں میں اس کاننٹ سے سسٹر ایلیکس کے ٹرانسفر کے بعد اس کی دوبارہ ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی حالانکہ اسے بہت بار ان کا خیال آتا رہتا تھا۔ کئی بار خیر دین اور وہ بیٹھے ماضی کو یاد کرتے تو وہ دونوں سسٹر ایلیکس کا ذکر بھی کرتے۔ بہت دفعہ اس نے خواہش بھی کی تھی کہ وہ بھی کہیں ان سے ملاقات کر پاتی لیکن زندگی اتنی تیز رفتار رہی تھی کہ وہ خواہش کے باوجود ان کو ڈھونڈنے اور ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کو عملی جامہ نہیں پہنا سکی تھی۔ انٹرکام اٹھا کر اس نے پی اے کا نمبر ملایا تھا۔ پی اے نے اس کی آواز سنتے ہی اسے شیردل کے اپنی رہائش گاہ پر نہ ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ لاہور میں تھا۔ اس نے پی اے کو لاہور میں اسے ٹریس کرنے کی ہدایات دینے کے بعد ہاتھ میں پکڑے کارڈ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔

”جی ان کافون بھی آیا تھا دو بار اسی فنکشن کے حوالے سے آپ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن آپ سیٹ پر نہیں تھیں۔“ پی اے نے اُسے سسٹر ایلیکس کے حوالے سے بتایا۔ عکس نے اس فنکشن میں جانے کی بابت..... پی اے کو اسکول انتظامیہ کو آگاہ کرنے کی ہدایات دیں اور فون ایک بار پھر رکھ دیا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر شیردل میں الجھ



”شیر دل کا مسئلہ حل ہوا؟“ اس رات کھانے پر خیر دین نے ایک بار پھر وہ موضوع چھیڑ دیا تھا جو سارا دن اس کے ذہن پر سوار رہا تھا۔

”وہ ایک مہینے کی چھٹی پر چلا گیا ہے۔“ عکس نے کھانا کھاتے ہوئے خیر دین کو اطلاع دی۔

”اللہ خیر کرے..... تمہاری بات ہوئی اس سے؟“ خیر دین کو تشویش ہوئی۔

”دونوں موبائل نمبرز آف ہیں اس کے اور وہ لاہور میں ہے اپنے پیرنٹس کے گھر پر..... اس کے آپریٹر نے نمبر دیا ہے وہاں کا۔ میں نے پیغام چھوڑا ہے اس کے لیے..... اگر کل وہ کال نہیں کرتا تو پھر میں کروں گی اُسے کال۔“ عکس نے خیر دین کو تفصیل سے بتایا۔

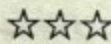
”تم نے پہلے کبھی اس سے بات کرنے کے لیے اس کی کال کا انتظار نہیں کیا تھا۔“ وہ خیر دین کی طرف سے آنے والے اس غیر متوقع سوال پر کچھ گڑبڑا گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ خیر دین اس کی اس تفصیلات میں سے کوئی ”حیران کن تجزیہ“ نکال سکتا ہے۔

”نانا یہ اس کا اور اس کی بیوی کا معاملہ ہے، ایک پرسنل ایٹو ہے، مجھے نہیں پتا کہ اسے اس مسئلے کو کسی دوسرے کے ساتھ ڈسکس کرنا اچھا لگے گا یا نہیں۔“ اس نے بالآخر خیر دین کے ساتھ اپنی الجھن شیر کی۔

”تم اس کے ساتھ کچھ ڈسکس کرو یا نہ کرو کم از کم اس پریشانی میں اس کو حوصلہ تو دلا سکتی ہونا..... بیوی تو اچھی تھی اس کی تم ہی کہا کرتی تھیں پھر یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔“ خیر دین نے بات کرتے کرتے بات کا رخ بدل دیا اور جیسے عکس کو اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے بچالیا۔

”ماں تو بہت اچھی عورت تھی شیر دل کی بیوی کی۔“ خیر دین اب شرمین کے بارے میں سوچتا ہوا بول رہا تھا۔ ”پتا نہیں ایسا کیا ہو گیا کہ اس طرح گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اُس کی بیوی۔“ عکس کو خیر دین کی بات سنتے ہوئے مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب طرح کا احساسِ جرم ہونے لگا تھا۔ اگر خیر دین کو یہ پتا چل جاتا کہ وہ بھی کسی نہ کسی حد تک اس بگاڑ میں انوالوہی تو پتا نہیں اس کا ردِ عمل کیا ہوتا۔

”نانا سسٹر ایکٹس دوبارہ اسی کانونٹ میں آگئی ہیں۔“ عکس نے یک دم خیر دین کو اس موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی۔



سسٹر ایکٹس کو اپنے آفس میں آ کر بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی جب reception پر بیٹھے آفس اسٹنٹ نے انہیں ایک اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں بتایا جو اُن سے ملنا چاہتی تھی۔ سسٹر ایکٹس نے اپنے اسٹنٹ کو پہلے اُن وزیٹرز کو اندر بھیجنے کے لیے کہا جو ایڈمیشن اور اپنے بچوں کے حوالے سے مختلف ایڈیوڈ ڈسکس کرنے آئے تھے اور اس اولڈ اسٹوڈنٹ کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ اسکول کے اکثر اولڈ اسٹوڈنٹس کتنی بار ان سے ملنے وہاں آ جایا کرتے تھے۔ یہ ہر روز نہیں ہوتا تھا لیکن یہ اکثر اوقات ہوتا تھا اور سسٹر ایکٹس ایسی ملاقاتوں کو اپنی اپائنٹمنٹس میں سب سے نیچے رکھتی تھیں کیونکہ ایسی ملاقاتوں میں زیادہ تر گپ شپ ہوتی تھی یا پھر بعض اولڈ اسٹوڈنٹس اسکول میں اپنے بچوں یا فیملی کے بچوں کے لیے کچھ favours لینے کی کوشش کرتے

تھے۔ آج بھی ہمیشہ کی طرح سسٹر ایکنس نے اس وزیر کو سب سے آخر میں رکھا تھا۔ بالآخر جب سسٹر ایکنس نے تمام ملاقاتیوں سے فارغ ہو گئیں تو انہوں نے اسٹنٹ سے اس اولڈ اسٹوڈنٹ کے بارے میں پوچھا۔
 ”وہ مجھ سے پوچھ کر چلی گئی تھیں کہ سسٹر کب تک فری ہو کر ان سے ملیں گی؟ میں نے کہا ”سچ بڑیک کے بعد“ تو وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ تب دوبارہ آجائیں گی لیکن ابھی.....“ اسٹنٹ نے سسٹر ایکنس سے بات کرتے کرتے عکس مراد علی کو دوبارہ آفس میں آتے دیکھ لیا۔ وہ بالکل اس وقت پر آئی تھی جس وقت کا اسٹنٹ نے اُسے بتایا تھا۔ اسٹنٹ نے سسٹر ایکنس کو اس کی آمد کی اطلاع دی۔ ”ڈاکٹر عکس نام ہے۔“ اسٹنٹ نے سسٹر ایکنس کے استفسار پر بتایا پھر عکس کو اندر جانے کے لیے کہا۔
 ”Good afternoon sister“ سسٹر ایکنس نے سر اٹھا کر اسے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور پھر جیسے سینڈز میں اسے پہچان لیا۔

”عکس مراد علی۔“ انہوں نے اس کی greeting کا جواب دیتے ہوئے بے حد بے یقینی سے اس کا پورا نام لیا۔ عکس بے اختیار ہنس پڑی اسے کوئی زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ سسٹر ایکنس اس کے بچپن میں بھی اسکول میں پڑھنے والے سیکڑوں بچوں کو اسی طرح ان کا پورا نام لے کر یاد رکھا کرتی تھیں لیکن اب اس عمر میں بھی ان کی یادداشت کا اسی طرح شاندار ہونا ایک عام آدمی کے لیے حیران کن تھا۔

”ڈاکٹر عکس مراد علی؟“ ٹیبل کے اوپر سے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اب انہوں نے دوسری بار ستائشی انداز میں اس کا نام لیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سسٹر ایکنس کی اس ستائش آمیز حیرت پر مسکرا دی تھی۔ اس سے بڑی گرم جوشی سے باتیں کرتے ہوئے سسٹر ایکنس نے جیسے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ایک سیاہ سوٹ کے اوپر ایک آف وائٹ ٹی کارڈ جرسی پہنے اس ڈبلی پٹی سانولی لڑکی میں انہیں وہی تنگ اور تمکنت نظر آئی تھی جو اس ننھی بچی کی بھی شناخت تھی جس کی ملائم ریشمی آواز پر وہ جان چھڑکتی تھیں۔ ان آنکھوں کی چمک آج بھی اس کی ذہانت کو عیاں کر رہی تھی۔ اس حادثے کا کوئی رنگ انہیں اس مسکراتے ہوئے پُر اعتماد چہرے میں کہیں نہیں دکھا تھا جس نے تب کئی مہینوں تک اس ننھے وجود کو کُملائے رکھا تھا۔ سسٹر ایکنس کو دلی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس ذہین لڑکی کو ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا اس ذہین لڑکی نے اس سے زیادہ بڑے پہاڑ سر کر لیے تھے جن پر وہ اس کا نام دیکھنا چاہتی تھیں۔ ٹیبل پر پڑا اس کا فون وہاں رکھے جانے کے چند ہی منٹ بعد بجنے لگا تھا جسے عکس نے بہت معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر silent کیا تھا لیکن silent ہونے کے باوجود سسٹر ایکنس اس پوری گفتگو کے دوران بار بار اس فون پر چلتی بجھتی روشنیوں کا سیلاب دیکھتی رہیں وہ ہر چند منٹ بعد کسی میسج یا کال کا اعلان کر رہا تھا۔

”بہت busy ڈاکٹر ہو تم!“ سسٹر ایکنس نے مسکراتے ہوئے اس کے فون کی طرف اشارہ کیا۔
 ”میں پریکٹس نہیں کرتی سسٹر۔“ عکس نے ان کی بات پر ایک لمحے کے لیے اپنے فون کو دیکھا پھر

ان سے کہا۔
 سسٹر ایکنس کے تاثرات سینڈز میں بدلے تھے انہوں نے بہت خفگی سے اسے جھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ عکس مسکراتے ہوئے ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی، اسے ان سے اسی بات کا خدشہ تھا۔ جب سسٹر ایکنس کی ناراضی زیادہ بڑھ گئی تو عکس نے انہیں اپنے موجودہ پروفیشن کے متعلق نرم آواز میں بتایا۔ سسٹر ایکنس چند لمحوں

کے لیے بھونچکا رہ گئی تھیں۔ شہر میں تعینات ہونے والی پہلی خاتون DCO کے بارے میں وہ واقف تھیں، نام سے بھی واقف تھیں اور چند دن پہلے انہوں نے اسے اسپورٹس ڈے پر دعوت دینے کے لیے کارڈ بھیجا تھا لیکن انہیں بالکل شائبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ یہ عکس مراد علی ہوگی۔۔۔۔۔ وہ جو ان کے بالمقابل میز کے دوسری طرف پڑی دو کرسیوں میں سے ایک پر بڑی میز اور شائستگی سے کرسی کے ہتھوں پر بازو لگائے، گھٹنے جوڑے، پاؤں بلائے بالکل سیدھی پشت کے ساتھ بے حد مؤدب انداز میں بیٹھی تھی۔ وہ اس شہر کی DCO تھی جو اپنے آفس میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے ریوالونگ چیئر پر بے حد کڑوہ سے بیٹھتی تھی۔ کہیں پہنچنے پر لوگ اس کا باہر نکل کر استقبال کرتے تھے۔ وہ وزیٹرز روم میں بیٹھ کر انتظار کر کے اٹھ جانے کے بعد دوبارہ اسی طرح وہاں نہیں آ جاتی تھی۔

”میں اسپورٹس ڈے پر آنا چاہتی تھی اس لیے میں نے سوچا میں آ کر آپ کو بتا دوں اور آپ سے مل بھی لوں۔“ وہ اسی انکسار سے سسٹر ایکنس کو بتا رہی تھی۔ سسٹر ایکنس کو چند لمحے واقعی کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔ ان کے ایکس اسٹوڈنٹس میں سے بڑے عہدوں پر پہنچنے والوں کی کمی نہیں تھی مگر زندگی میں کامیابی کے اوپر والے زینے پر کھڑے ہو کر بھی چلا کر بات کرنے کے بجائے جھک کر مدہم آواز میں بات کرنے والے انہوں نے بھی بہت کم دیکھے تھے اگر خاندان، ذات برادری کو کہتے تھے تو پھر وہ کوئی خاندان نہیں رکھتی تھی اور اگر خاندان اخلاقی اقدار اور تمیز و تہذیب کو کہتے تھے تو پھر سسٹر ایکنس نے ڈاکٹر عکس مراد علی سے بڑھ کر خاندانی کوئی نہیں دیکھا تھا۔

”بہت غلط فیصلہ تھا۔!“ ابتدائی شاک سے نکل آنے کے بعد سسٹر ایکنس نے ایک بار پھر اسے ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک جھپٹی ہوئی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ ان کی ڈانٹ ڈپٹ سنتی رہی اسے اندازہ تھا کہ وہ میڈیسن پریکٹس نہ کرنے پر اسے یہی کہیں گی۔ خیر دین کے بعد وہ دوسری شخص تھیں جن کے لیے میڈیسن مسیحا تھی اور دنیا کا اور کوئی پروفیشن اس کے قریب بھی نہیں آ سکتا تھا۔

”اور جب تک میں یہاں ہوں اگر میں آپ کے لیے، اسکول کے لیے کچھ بھی کر سکی تو پلےز مجھے ضرور بتائیے گا۔“ چائے پیتے ہوئے اٹھنے سے چند لمحے پہلے اس نے سسٹر ایکنس سے کہا تھا۔ سسٹر ایکنس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اسکول کے عقب میں واقع ایک سرکاری پلاٹ کا ذکر کرنا شروع کیا جسے اسکول بہت عرصے سے اسکول کے گراؤنڈ میں توسیع کے لیے خریدنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ سسٹر ایکنس کو اب امید تھی کہ عکس مراد علی کے اس سیٹ پر ہونے کی وجہ سے اسکول بالآخر وہ پلاٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس پلاٹ کی شمولیت سے اسکول میں بچوں کے لیے گیمز کی بہتر سہولیات میسر آ سکیں گی۔ عکس نے خاموشی سے بغور سسٹر ایکنس کی بات سنی۔ وہ مطالبہ اور درخواست کوئی نیا مطالبہ نہیں تھا۔ اسکولز اور کالجز اپنی تقریبات میں مدعو کرنے کے بہانے عام طور پر ضلعی انتظامیہ کے سامنے اس طرح کے مطالبے پیش کرتے تھے یا پھر مختلف گرانٹس کے لیے درخواستیں۔۔۔۔۔

”میں دیکھوں گی میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس پلاٹ کے سلسلے میں، میں آپ کی کوئی مدد کر پاؤں گی۔“ عکس نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے متانت سے سسٹر ایکنس کو بتایا۔ انہیں اس کے جواب نے حیران کر دیا تھا۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں ”انکار“ کی توقع عکس مراد علی کے

ہاں اس طرح آنے اور بیٹھنے کے بعد خواب میں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

”لیکن تم کر سکتی ہو تمہیں authority ہے اس کی۔“ سسٹر ایکنس نے اصرار کیا۔

”authority ہے لیکن rules کو violate کیے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اسکول پرائیویٹ ہے۔ privileged class کے لیے کام کر رہا ہے اور مالی طور پر بہت مستحکم ہے۔ کیتھولک بورڈ آف ایجوکیشن سے بہت زیادہ فنڈنگ بھی مل رہی ہے اسے..... اور قواعد و ضوابط کے مطابق میں ایسے کسی ادارے کو سرکاری زمین الاٹ نہیں کر سکتی۔ یہ میں بھی کر سکتی ہوں جب میں تمام rules کو باقی پاس کر دوں اور وہ میں نہیں کر سکتی۔ وہ زمین ویسے بھی اس علاقے کے ایک چلڈرن پارک کے لیے مختص ہے اور ضلعی انتظامیہ نے اس سال بجٹ میں اس کے لیے فنڈز رکھے ہیں چند مہینوں تک اس پر کام شروع ہو جائے گا۔“ سسٹر ایکنس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات سننے کے بعد کہا۔

”You know Dr. Aks Murad Ali..... اس اسکول کے بھی بہت سارے rules تھے لیکن میں نے تمہیں دوبارہ ایڈمیشن دلانے کے لیے اور پھر تمہاری تعلیم کو ہر طریقے سے جاری رکھوانے کے لیے بہت سے rules کو violate بھی کیا تھا اور باقی پاس بھی۔“ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے بتایا۔ انہیں اس کا انکار کھلایا تھا۔

”اگر آپ سسٹر ایکنس کی اسٹوڈنٹ رہی ہوتیں تو آپ کے لیے بھی rules کو violate کرنا میری طرح مشکل ہوتا۔“ جواب اُسی منانت اور ذہانت سے آیا تھا۔ سسٹر ایکنس بے اختیار لا جواب ہوتے ہوئے ہنس پڑیں۔ اس نے انہیں tribute نہیں کیا تھا لیکن ان کے لیے اپنے کیس کو argue کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا تھا۔

”تمہاری گاڑی کہاں ہے؟“ اُسے باہر چھوڑنے کے لیے آتے ہوئے سسٹر ایکنس نے اس سے پوچھا۔

”وہ گیٹ سے باہر ہے سسٹر۔“ عکس نے کہا۔

”میں گیٹ کھلواری ہی ہوں تم گاڑی اندر منگوا لو۔“ سسٹر ایکنس نے اس سے کہا۔

”Thank you sister..... لیکن میں کبھی کسی اسکول یا کالج کے اندر گاڑی لے کر نہیں

جاتی۔“ عکس نے جواباً ان سے کہا تھا۔

سسٹر ایکنس اس کے منع کرنے کے باوجود اسے پارکنگ تک چھوڑنے آئی تھیں اور پارکنگ میں اسے رخصت کرتے ہوئے انہوں نے عکس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”I am very proud of you“ عکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ وہ مودب انداز میں ان کی بات سننے لگی۔

”میری خواہش ہے کہ تم اپنے اصولوں اور ویلیوز کو ہمیشہ اسی طرح رکھنا That is your real

strength

”I will“ وہ کہہ کر مسکرائی اور اس نے سسٹر ایکنس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سسٹر ایکنس نے اسے اپنی سیاہ اسٹاف کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ جس کا ڈرائیور اب اس کے لیے دروازہ کھولے مستعد انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے اندر بیٹھتے ہی اس کے سیکورٹی گارڈ نے ڈرائیور کی طرح اس کے برابر والی سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی اسٹاف کار کے عقب میں موجود پولیس موبائل بھی حرکت میں آگئی تھی۔ سسٹر ایکنس وہیں کھڑی اس کی گاڑی کو

پارکنگ سے سڑک اور پھر سڑک سے موڑ کر غائب ہوتے دیکھتی رہیں۔ یہ وہ تعظیم تھی جو وہ ایک ڈپٹی کمشنر کی کار کو نہیں دے رہی تھیں، نہ DC عکس مراد علی کو..... یہ وہ تعظیم تھی جو وہ انسانی اہمیت، حوصلے، ثابت قدمی کی اس چھوٹی سی کہانی کو دے رہی تھیں جس کی ایک چشم دید گواہ وہ بھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کردار اس کہانی میں ان کا بھی تھا اور انہیں فخر ہوا تھا، واقعی فخر ہوا تھا۔

انہوں نے جس سبک قدم، باوقار لڑکی کو سبز نمبر پلیٹ والی سرکاری گاڑی پر پولیس escort اور پروٹوکول کے ساتھ کچھ دیر پہلے وہاں سے جاتے دیکھا تھا اسے ایک کبھی بچی کے روپ میں اپنے نانا کی ایک پرانی سائیکل پر بیٹھے سردی، گرمی، برسات، خزاں، بہار کے ہر موسم میں وہاں اس سڑک پر آتے دیکھا تھا..... گئی بار..... اور بار بار..... چلچلاتی دھوپ میں پسینے میں شرابور سرخ چہرے کے ساتھ..... کبر آلود سردی میں خشکی سے بخ بستہ سرخ ناک اور سرخ گالوں کے ساتھ ٹھٹھرتے کانچے..... اس پرانی سائیکل سے اس سرکاری گاڑی کا سفر اس انتخاب کا نتیجہ تھا جو انسان مصائب کے پہاڑ کے سامنے کانپتے پیروں پر کھڑے رہنے یا گھٹنوں پر گر جانے کی شکل میں کرتا ہے۔ سسٹر ایلنس کے پاس آج اپنے لیکچرز میں quote کرنے والی ایک اور مثال آگئی تھی۔

☆☆☆

بختیار اور منترہ، شرمین اور شہر بانو کو کسی طرح واپس لے آنے پر تو کامیاب نہیں ہو سکے لیکن شہر بانو divorce کے لیے کیس فائل کرنے سے پہلے شیردل کے سے فون پر بات کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ شیردل کو تب تک شہر بانو کے حوالے سے کوئی خوش فہمی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اب اس سے بدترین سے بدترین حماقت کی بھی توقع کر رہا تھا اور بختیار سے یہ سن کر اُسے اس موقع کے باوجود شک لگا تھا کہ وہ divorce کے لیے کیس فائل کرنے کا طے کر چکی تھی۔ کسی بھی پرسکون شادی شدہ زندگی گزارنے والے مرد کو ان حالات میں اسی طرح کی کیفیات سے گزرنا پڑتا۔ شہر بانو سے وہ گفتگو اس کی شادی شدہ زندگی کو بچانے کا جیسے ایک آخری موقع تھا شیردل کے لیے اور اس نے اپنے دل و دماغ کو ایک عجیب حالت میں پایا تھا۔ اسے شہر بانو کو اپنی زندگی میں دوبارہ واپس لانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ محبت اور اعتماد نام کا وہ رشتہ جس میں وہ اتنے سالوں سے جڑے ہوئے تھے وہ اتنی بُری طرح سے اور اتنی جگہوں سے ٹوٹا تھا کہ اب کم از کم شیردل کو اس کو پھر سے جوڑ لینے کی کوئی خواہش نہیں تھی یا کم از کم فی الحال نہیں تھی لیکن اس کی مجبوری اور کمزوری وہ اولاد بھی جو شہر بانو کے پاس تھی۔ مثال اس کے پاس نہ ہوتی تو شیردل، شہر بانو سے لاکھ محبت رکھنے کے باوجود بھی اس طرح کے حالات میں اس سے علیحدگی اختیار کرنے میں چند دن بھی نہ لگاتا۔

”اس سے بہت محل سے بات کرنا، وہ اس وقت عقل سے پیدل ہو رہی ہے لیکن تم سمجھ دار ہو، اس کا اتنا نقصان نہیں ہونا جتنا تمہارا ہوگا۔“ بختیار نے اسے شہر بانو سے بات کرنے سے پہلے بہت سمجھایا تھا۔ وہ شیردل کی ذہنی وجہ بانی کیفیت کو ایک باپ کے طور پر سمجھتے تھے۔ شیردل نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اس سے یہ سب نہ بھی کہہ رہے ہوتے تب بھی اسے پتا تھا نقصان کس کا ہو رہا تھا اور کس کا ہونے والا تھا۔

دوسرے دن بالآخر اس کی اور شہر بانو کی بات ہو گئی تھی۔ فون پر اس کی آواز سننے ہی شیردل کا خون کھولنے لگا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ کرنے والا مرد نہیں تھا، نہ ہی اتنا اور خود پرستی کا مارا ہوا تھا لیکن اس

کے باوجود شہر بانو کے سامنے اسے ایک عجیب سی تضحیک اور ذلت کا احساس ہو رہا تھا اور تضحیک کے اس احساس کے ساتھ اس کے ساتھ نارمل، خوشگوار انداز میں بات کرنا بے حد مشکل تھا..... ہیلو کے تبادلے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے ایک دوسرے سے حال احوال نہیں پوچھا تھا۔ بات کہاں سے شروع کی جائے یہ شیردل کا مسئلہ تھا شہر بانو کا نہیں کیونکہ اسے شیردل سے کچھ نہیں کہنا تھا نہ ہی مصالحت کی کوشش کرنی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرنا شیردل کی ذمہ داری تھی۔ مرد کے لیے عورت کے سامنے جھکنا ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے اور خاص طور پر تب جب غلطی عورت کی ہو اور جھکنا پھر بھی مرد کو پڑ رہا ہو۔ یہ جیسے اس کے لیے کٹ مرنے کا مقام ہوتا ہے اور شیردل کے سامنے آزمائش کا یہ پہاڑ لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔

”شہر بانو میں patch up چاہتا ہوں جو بھی کچھ ہوا۔ Let's get over with it..... تم اگر چاہتی ہو کہ میں معذرت کروں..... تو میں، وہ کرنے پر بھی تیار ہوں لیکن واپس آ جاؤ، ہم ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر یہ مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔“ شیردل نے زندگی میں کبھی تھوک کر نہیں چاہا تھا اور اب اُسے چاہنا پڑ رہا تھا۔ یہ چند جملے زبان سے ادا کرنے کے لیے اس نے جیسے اپنی انا اور عزت نفس نام کی چیزوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

”کون سا مسئلہ؟“ ریسپور پر اس نے شہر بانو کو بے حد سہمہری سے کہتے سنا۔ اس کی آواز میں کوئی شناسائی تھی نہ کوئی پچھتاوا۔ وہ اس سے یوں بات کر رہی تھی جیسے زندگی میں پہلی بار ایک شیردل نام کے آدمی سے بات کر رہی ہو۔ ”تمہارے اور میرے بیچ کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں اور اگر کبھی تھا بھی تو ختم ہو چکا ہے۔ تم ایک اچھے لائف پارٹنر بننے کے قابل ہی نہیں تھے۔ میں نے تمہارا انتخاب کر کے غلطی کی اور اب وہ غلطی ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے شیردل کے کہنے کے لیے جیسے کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ایک کے بعد ایک جوتا اس کے منہ پر مارا تھا۔ اس نے پھر بھی ڈھیٹ بن کر اس سے کہا۔

”میں جانتا ہوں تم مجھ سے خفا ہو اور.....“ شہر بانو نے بے حد تلخی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”خفا؟..... میں تم سے خفا نہیں ہوں میں صرف اپنے آپ سے خفا ہوں، تمہارے ہاتھوں بے وقوف بننے کی وجہ سے..... اتنے سال تمہیں ایک وفادار شوہر سمجھنے کی وجہ سے۔“ شیردل نے اس کی بات یک دم کاٹ دی۔

”میں تم سے ہمیشہ وفادار رہا ہوں شہر بانو..... اور مجھے اس حوالے سے کوئی احساسِ جرم نہیں ہے۔“

شیردل نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”ہاں، تمہیں کیوں کوئی احساسِ جرم ہوگا۔ عکس مراد علی جیسی عورتوں کے ساتھ افیئر چلاتے ہوئے احساسِ جرم تھوڑی رکھتے ہیں۔ وہ تو فخر اور اعزاز کی بات ہوتی ہے۔“

”شہر بانو، عکس میری زندگی کا حصہ نہیں ہے، بہتر ہے تم اس پر بات نہ کرو..... تم اور مثال میری زندگی کا حصہ ہو۔“ شیردل نے نکل کا مظاہرہ کیا۔

”ہم تھے، اب نہیں ہیں۔“ اس نے شیردل کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔ ”میں نے تمہارے لیے وہ انتخاب آسان کر دیا ہے جو تم خود نہیں کر پارہے تھے۔ تم مجھ سے نہیں، عکس سے محبت کرتے ہو وہ matter

کرتی ہے تمہارے لیے..... اس لیے تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔“ شہر بانو کے موقف میں اب بھی ذرا برابر تبدیلی نہیں آئی۔ شیردل کو لگا وہ جیسے کسی پتھر سے سر پھوڑ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ ہونٹ کھینچے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے، تم اگر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا لیکن تم مثال کو اس طرح باہر نہیں لے جا سکتیں۔“ اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ غصہ جھلکنے لگا تھا جو وہ اپنے اندر دبائے پھر رہا تھا۔

”میں مثال کو اپنے ساتھ لا چکی ہوں اور میرا اسے واپس لانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ شہر بانو نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”تم بچے کی کسٹری شادی کے وقت مجھے لکھ کر دے چکے ہو۔“

”میں نے کسٹری تمہیں دی ہے، یہ نہیں کہا تھا کہ تم اسے اس طرح لے جاؤ اور پھر اس سے ملنے کے لیے مجھے تنگ کرو۔“ شیردل نے دُرشتگی سے کہا وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ شادی کے وقت ان دو شرائط کو ماننے پر اب بُری طرح پچھتا رہا تھا۔

”میں چاہتی ہوں تم ہم دونوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ اور عکس کے ساتھ خوشی خوشی زندگی گزارو۔“ شہر بانو میں شہباز حسین نہیں ہوں، میں مثال کو اس طرح کہیں رہنے نہیں دوں گا۔“ شیردل نے ایک بار پھر اس کی گفتگو میں عکس کے حوالے سے کیے جانے والے طنز کو نظر انداز کیا تھا۔

”مثال تم سے نہیں ملنا چاہتی اور وہ تمہارے بغیر میرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔“ شہر بانو نے بھی اسی سرد مہری سے کہا۔ وہ ایک موہوم آس جو اسے اس حوالے سے تھی کہ وہ محبت کی بات کرے گا اسے اپنے تعلق کے حوالے سے واپس بلائے گا۔ اس سے کہے گا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ شیردل کے لہجے میں کہیں وہ حلاوت، وہ محبت، وہ طلب نہیں تھی جس پر وہ قربان ہو جاتی تھی۔

بالکل اس لمحے جب شیردل اس سے کچھ کہنے لگا تھا اس نے شہر بانو کے ریسپور پر دور سے مثال کی آواز سنی وہ شہر بانو سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ شیردل سے بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز پر شیردل بے اختیار بے تابی سے اپنا غصہ بھول کر بولا۔

”میری بات کرو اور اس سے۔“
 ”نہیں، میں تمہارے پاپا سے بات نہیں کر رہی، تم باہر جا کر کھیلو۔“ شہر بانو نے شیردل کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”میں تم سے کہہ رہا ہوں اس سے میری بات کرو اور۔“ شیردل اس بار اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔
 ”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نہیں کرواؤں گی۔“ شہر بانو نے اُسی اکھڑ انداز میں کہا تھا۔ شیردل اس کے انکار پر ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ اس نے بلند آواز میں چلاتے ہوئے شہر بانو کو زندگی میں پہلی بار گالیاں دینا اور بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا..... شہر بانو ریسپور ہاتھ میں لیے فنچ چہرے کے ساتھ بے یقینی کے عالم میں شیردل کی گالیاں سنتی رہی۔ وہ اس مرد کو نہیں پہچانتی تھی جس کی آواز وہ فون پر اس وقت سن رہی تھی، گالی تو دور کی بات اس نے کبھی شیردل کی بلند آواز تک نہیں سنی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ، تنگی نام کی ہر چیز سے ایک شیردل نے اسے کبھی آشنا کیا ہی نہیں تھا اور اب وہ اس کے لیے وہ سارے الفاظ استعمال کر رہا تھا صرف اس لیے کیونکہ وہ

ایک محبت ہے..... بلکہ اسے اس وقت بھی عکس ہی کا خیال آیا تھا، وہ اب بھی یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ وہ بہت جلد ہی ہو کر سوچ رہی تھی اور شیردل کا ردِ عمل اس کی غلطیوں کا نتیجہ تھا۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر شیردل کی بار بار آنے والی کالز کو بھی اس نے ریسو نہیں کیا تھا۔ اس کے اور شیردل کے بچ اس دن کچھ باقی نہیں بچا تھا یا کم از کم شہر بانو کو یہی لگا تھا۔

☆☆☆

عکس بے یقینی سے خیر دین کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ یوں جیسے اس کو یقین ہی نہ آرہا ہو کہ یہ سب کچھ اس نے خیر دین کے منہ سے سنا تھا۔

”نانا یہ سب آپ سے شہر بانو کی ممی نے کہا؟“ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شرمین امریکا سے کال کر کے خیر دین سے اس کے اور شیردل کے حوالے سے بات کریں گی لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ انہوں نے نمبر کہاں سے لیا تھا؟ اور یہ مشورہ کس کا تھا..... اس سے بھی بڑا سوال عکس کے لیے یہ تھا کہ انہوں نے اس کی ضرورت کیسے محسوس کی تھی۔ خیر دین بھی اسی کی طرح رنجیدگی اور صدمے کا شکار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حواس باختگی کا بھی..... چڑیا پہلی بار ان کے لیے کسی کے سامنے رُسوائی اور ندامت کا باعث بنی تھی۔ وہ بھی کس کے سامنے شہباز حسین کی سابقہ بیوی کے سامنے..... اور کس چیز کے لیے..... بھرے بازار میں جیسے ایک بار پھر کسی نے اس کی ریڑھی اٹا دی تھی۔ اور کچھ ویسی ہی حالت عکس کی ہو رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے بتانے کے سامنے کبھی کوئی اس کی ایسی شکایت کرے گا اور اسے صفائی دینی پڑے گی۔

”نانا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں شہر بانو کی ممی سے خود بات کر لوں گی۔ انہیں اور شہر بانو کو غلط فہمی ہو رہی ہے اور اس کی وجہ اس کیس پر شیردل کی حمایت ہے اور کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے بالآخر خیر دین کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت وہ مکمل طور پر حواس باختہ تھی۔

”جو ادے گھر والوں نے شیردل کی وجہ سے رشتہ ختم کیا تھا؟“ خیر دین نے اس کے سر پر جیسے ایک اور بم پھوڑا۔ پتا نہیں خیر دین آج کتنے انکشافات کرنے پر تھکا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر لفظ ڈھونڈنے کی جدوجہد کرنے لگی۔

”آپ سے کس نے کہا؟“ اس نے بہ مشکل خیر دین سے پوچھا۔

”شہر بانو کی ممی نے ہی بتایا۔“ عکس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ندامت سی ندامت تھی وہ امریکا میں بیٹھے ہوئے بھی سب کچھ جانتی تھیں۔

”نانا میں شیردل سے محبت کرتی ہوں، میں زندگی میں ایک شیردل سے زیادہ کسی کو نہیں چاہ سکتی لیکن مجھے اس کی زندگی کا سا بھی بننے کی تمنا نہیں ہے۔ یہ ایک خواب میں نے بھی نہیں دیکھا۔“ اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بھرا گئی تھی۔ ”میں نے اس سے تب بھی شادی نہیں کی جب وہ غیر شادی شدہ تھا تو اب اس کا گھر توڑ کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کیوں کروں گی میں.....؟ میں نے آپ سے یہ نہیں سیکھا..... میں شہباز کا کوئی بدلہ شہر بانو سے نہیں لوں گی، نہ ہی آپ ایسا سوچیں، اس نے اپنے اعتراف سے خیر دین کو ششدر کر دیا تھا۔ اسے عکس سے اس اعتراف کی توقع تھی نہ اس کے اس طرح کمزور پڑنے کی۔

”میں شیردل کو بٹو کر اس سے بات کروں گا۔“ خیر دین کو خود سمجھ نہیں آئی کہ اس کے منہ سے یہ جملہ کیوں

نکلا تھا۔ وہ آخر شیردل کو بولا کہ اس سے کیا بات کر سکتا تھا۔

”نانا آپ اس سے کچھ بات نہیں کریں گے، نہ ہی اس سے کوئی شکایت کریں گے۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ میں نہیں چاہتی اس کے لیے مزید شرمندگی کا کوئی ذریعہ بنے آپ کی کوئی شکایت یا بات.....“
عکس نے فوری طور پر خیر دین سے اختلاف کیا تھا۔

خیر دین بہت دیر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ”تم پر بد اعتمادی یا بے یقینی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے میرے لیے چڑیا..... میں تم پر اندھا اعتماد کرتا ہوں لیکن اندھا نہیں ہو سکتا۔ شہر بانو کی ماں ایک اچھی عورت ہے۔ بہت احسانات ہیں اس کے ہم پر۔“ عکس چپ چاپ خیر دین کی بات سننے لگی۔ اس نے ساری زندگی خیر دین کو لوگوں کے احسانات گناتے دیکھا تھا اور احسان فراموشی کو چھپاتے۔ وہ اب بھی سننا چاہتی تھی کہ اس کے پاس شہر بانو کی ماں کے حوالے سے گنوانے کے لیے کون سے احسانات تھے۔

☆☆☆

شرمین کو بالکل توقع نہیں تھی کہ عکس انہیں خود کال کر سکتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے عکس کو اس کی خیر دین کو کال کی توقع نہیں تھی۔ کہیں نہ کہیں انہیں بھی یہی توقع تھی کہ وہ کبھی اتنی ہمت نہیں کر پائے گی کہ اس ایٹو پر بات کرنے کے لیے انہیں بھی کال کرتی لیکن اس نے کر دی تھی۔
چند سیکنڈز کے لیے فون پر اس کا نام سننے پر انہیں سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ فون بند کریں اس کی بات سننے سے انکار کریں یا اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی تباہ کرنے پر اس پر چلائیں۔

”ہیلو۔“ عکس نے انہیں اس طرح خاموش پانے پر بے ساختہ ان کی لائن پر موجودگی چیک کی تھی۔
”میں سن رہی ہوں۔“ شرمین نے بے حد سردمہری کے ساتھ کہا۔ زندگی میں انہوں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ آکورڈ پچویشن میں کبھی نہیں پایا تھا۔

”مسز فاروق آپ کو میرے اور شیردل کے حوالے سے جو غلط فہمی ہے، میں اسے کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔“
عکس نے کسی تمہید کے بغیر کہا تھا۔ ”شیردل ایک دوست ہے اور بیچ میٹ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“ شرمین نے بے حد غلطی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

”کوئیگ اور بیچ میٹ۔۔۔ آدمی رات کو ایک دوسرے کے بیڈروم میں نہیں پائے جاتے۔“ عکس سے بات نہیں ہو سکی۔ وہ اس پر بڑا سنگین الزام لگا رہی تھیں لیکن کس طرح۔
”میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔“ اس نے جیسے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا۔

”میں کیا کہہ رہی ہوں تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔ بچپلی بار جب تم سے میری بات ہوئی تھی تو کہاں تھی تم؟ کس کے فون پر تم نے مجھ سے بات کی تھی اور رات کے کس وقت کی تھی؟ تم سنگاپور میں شیردل کے بیڈروم میں اس کے فون سے بات کر رہی تھیں اور تم مجھے کہہ رہی ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے، تمہاری یادداشت کمزور ہو گئی میری نہیں۔“ ایک زلزلہ وہ تھا جو ریسور کے دوسری طرف موجود عکس نے اپنے گرد آتا محسوس کیا تھا اور دوسرا زلزلہ وہ تھا جو دروازے میں کھڑی شرمین کی باتیں سنتی ہوئی شہر بانو کے اندر آیا تھا۔ شرمین نے ایک بار بھی عکس کا نام نہیں لیا تھا لیکن وہ سیکنڈز میں ان کی مخاطب کو بوجھ گئی تھی اور گفتگو کی نوعیت سننے کے بعد اسے لگا

تھا۔ میں گر جائے گی۔ اس کے پاؤں یک دم جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔ وہ شیردل پر مسلسل عکس کے ساتھ ان کے اصرار کا جواب دیتی تھی۔ اس سے محبت کرنے پر اسے معتبہ ٹھہرا رہی تھی لیکن وہ یہ بھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شیردل اور عکس کا رشتہ کبھی ان حدود کو چھو سکتا تھا۔ شیردل اتنا گر سکتا تھا۔

شرمین کو آخری جملہ بولتے بولتے کمرے میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوا تھا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ گردن موڑنے پر انہیں کھلے دروازے میں کھڑی شہر بانو نظر آئی تھی جس کا چہرہ اس طرح فق تھا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے شرمین بھی فریز ہو گئیں پھر انہوں نے عکس سے کچھ بھی کہے بغیر لائن ڈسکنٹ کر کے فون آف کر دیا تھا۔ انہوں نے شہر بانو کو سہارا لے کر کمرے کے دروازے کے ساتھ اس کے پاس پڑے صوفے پر بیٹھتے دیکھا۔ وہ جیسے خود کو گرنے سے بچا رہی تھی۔ شرمین سب کچھ چھوڑ کر بے اختیار لپک کر اس کے پاس آئی تھیں۔ اس کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، بے حد سرد ہو رہا تھا۔

”تم ٹھیک ہو؟“ شرمین نے بے ساختہ اس کے سر پر ہاتھ پڑتے ہوئے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا یہ؟“ اس نے جواباً جیسے بہ مشکل شرمین سے کہا تھا اس کی آواز جیسے کسی کھائی سے آرہی تھی۔ وہ ماں کی طرف دیکھ بھی نہیں پارہی تھی۔

”میں تمہیں اس تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔“ شرمین نے رنج کے عالم میں اس سے کہا۔ ”میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا جس پر تمہیں اتنا ناز تھا۔“ وہ اس کا مذاق نہیں اڑا رہی تھیں لیکن شہر بانو کو یہ سن کر لگا تھا جیسے شرمین نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا تھا، جیسے ساری دنیا ہنستے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

”میں تمہارا وہ گھر بچانا چاہتی تھی جو تم نے بنایا تھا۔ جس پر تمہیں اتنا مان تھا۔“ گھر..... کون سا گھر؟.....

”کون سا مان؟..... رشتہ کون سا رشتہ؟..... اعتبار؟..... اعتبار؟..... کون سا اعتبار۔“

”کھلے دروازے سے مثال اندر آئی تھی۔ ایک ٹیڈی بیر ہاتھ میں پکڑے..... ماں اور شرمین کی کیفیت سے بے خبر..... اور اس نے اندر آتے ہی ہمیشہ کی طرح وہی ایک بات کہی تھی جو وہ صبح شام سیکڑوں بار دہراتی تھی۔

”مئی مجھے پاپا کے پاس جانا ہے، میں ان کو ہنس کر رہی ہوں۔“ شہر بانو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر اس نے کہا۔

”تمہارے پاپا مر چکے ہیں۔“ مثال نے عجیب خوف اور بے یقینی سے ماں کو دیکھا تھا۔ پھر شرمین کو.....



ایک زلزلے کی لپیٹ میں آئے ہوئے شخص کی طرح عکس نے شرمین کے فون بند کر دینے کے بعد بھی کئی بار اسے کال ملانے کی کوشش کی تھی۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ اسے پہلی بار اب ہوا تھا اور ساتھ شیردل کی پریشانی کا بھی..... وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی بھی طرح سے کسی کی ازدواجی زندگی میں آنے والے

بھونچال کا ذمے دار قرار دی جا سکتی تھی اور وہ بھی شیردل کی زندگی میں.....

اسے اندازہ نہیں تھا کہ شرمین نے خیر دین سے کیا کہا تھا..... کیا یہ سنگین اور گھٹیا الزام انہوں نے نانا کے

سامنے بھی دُہرایا تھا؟ اسے جیسے شرم آئی تھی لیکن اگر خیر دین سے شرمین نے ایسی کوئی بات کی ہوتی تو وہ اس کے بارے میں بھی پوچھتا۔ وہ جیسے مڑی کے جالے کے تار میں اُلجھی لٹک رہی تھی، زندگی میں پہلی بار اس نے کسی سے اس طرح کی مدد لی تھی اور وہ مدد اب اس کے حلق میں ہڈی بن کر اٹک گئی تھی۔ وہ اب بُری طرح پچھتا رہی تھی کہ اس نے شیردل کا فون استعمال کیوں کیا..... کر لیا تھا تو شرمین کی کال کیوں لی..... لیکن بعض دفعہ بد قسمتی انسان سے وہ کام کروا رہی ہوتی ہے جو وہ عام حالات میں کبھی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

اس دن اس نے ایک بار پھر شیردل سے رابطہ کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی اور ایک بار پھر ناکام رہی تھی۔ اس کا سیل فون ہمیشہ کی طرح بند تھا اور اس کے والدین کی لاہور کی رہائش گاہ سے اس کے ”غیر موجود“ ہونے کی خبر کے علاوہ کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ عکس کو اب اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا اور اسے ہی نہیں شاید ساری دنیا کو نظر انداز کر رہا تھا کیونکہ اس کی ازدواجی زندگی میں ہونے والے سارے مسئلے اس کی وجہ سے ہوئے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا ہو کہ اس سے رابطہ مستقل طور پر منقطع رکھ کر وہ اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا۔

وہ ایک کے بعد ایک تو جیہہ پیش کرتی اور اسے رد کرتی رہی پھر اس نے جیسے خود بھی یہی طے کیا تھا کہ وہ شیردل سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اگر اس کو لگتا تھا کہ وہ اس کی مدد کے بغیر اس مسئلے کا حل نکال سکتا تھا تو پھر اسے شیردل کو یہ کام کرنے دینا چاہیے تھا۔

”نانا آپ سجاد سے میری شادی طے کر دیں۔“ شرمین سے ہونے والی گفتگو کے تیسرے دن رات کے کھانے کے بعد اس نے خیر دین سے کہا تھا۔ حلیمہ اگلے ویک اینڈ پر پاکستان سے واپس جا رہی تھی اور اس نے اپنی سسرال سے فون کر کے اس صبح عکس سے سجاد کے سلسلے میں دوبارہ بات کی تھی۔ خیر دین اس کی بات پر حیران ہو گیا تھا۔

”لیکن تم تو پہلے ملنا چاہتی تھیں اس سے۔“

”ہاں لیکن اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ امی مل چکی ہیں اس سے..... آپ بھی مل لیں۔ اس کی فیملی ایک فنکشن میں مجھ سے مل چکی ہے۔ ہم دونوں کی ایک ملاقات کی اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کو وہ ٹھیک لگتا ہے تو بس کافی ہے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور اس کی یہ سنجیدگی خیر دین کو جیسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ شادی کے لیے اس طرح فوری طور پر مان جانا..... اور وہ بھی لڑکے سے طے بغیر جبکہ اس سے پہلے وہ ہمیشہ طے بغیر کسی بھی لڑکے سے شادی کے خلاف تھی اور خیر دین کو بھی ہمیشہ یہی مناسب لگا تھا کہ وہ لڑکے سے خود مل لے اگر اسے مناسب لگتا پھر ہی وہ لوگ بات آگے بڑھاتے۔

خیر دین نے اس سے وجہ پوچھنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ انہیں لگا تھا وہ شیردل کے معاملے کی وجہ سے شادی میں جلدی کرنا چاہتی تھی۔ شرمین کے حوالے سے بھی ان دونوں کے درمیان اس ایک گفتگو کے علاوہ کوئی اور گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ عکس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خیر دین سے شرمین کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی تفصیلات جاننے پر اصرار کرتی، نہ ہی شرمین کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو کو وہ خیر دین کے سامنے دُہرا سکتی تھی لیکن اسے یہ احساس ہوا تھا کہ شرمین نے شاید خیر دین سے اس واقعے کا ذکر کیے بغیر اس پر الزامات لگائے تھے اور اگر انہوں نے ایسا کیا تھا تو وہ اس کے لیے شرمین کی بہت احسان مند تھی اور احسان مندی کی بعض شکلیں مذاق سے کم

اگلے چند دنوں میں خیر دین نے سجاد کی فیملی کو بلوا کر عکس کے نہ چاہنے کے باوجود اس کی اور سجاد کی ملاقات کروادی تھی۔ وہ ایک مناسب شکل صورت کا ایک اچھا قابل ڈاکٹر تھا اور اچھا بیک گراؤنڈ تھا اس کا..... عکس اور اسے دونوں کو اپنے پانچ سالہ دورِ تعلیم کے دوران کسی آمنے سامنے کی کوئی یادیں نہیں تھیں لیکن سجاد پھر بھی عکس کی بہترین اسٹوڈنٹ کے طور پر اسے بہت اچھی طرح یاد رکھے ہوئے تھا اور اس حوالے سے اس کے لیے اچھی فیلنگز رکھتا تھا..... ایک اور مشکل مرحلہ آیا تھا اور ایک اور مشکل مرحلہ طے کر لیا تھا اس نے۔ اس بار منگنی کی کوئی باقاعدہ رسم نہیں کی گئی تھی صرف بات طے کر کے چند مہینوں بعد سجاد کے پاکستان کے اگلے وزٹ پر شادی کی تاریخ طے کر دی گئی تھی۔

وہ جواد سے رشتہ طے ہوتے ہوئے خوش تھی لیکن سجاد سے نسبت طے ہوتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی جی محسوس کی تھی یوں جیسے یہ کوئی آفیشل ورک تھا..... اس کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ نہیں تھا۔ وہ ناخوش نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا تھا لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی یا کم از کم خوشی نام کی اس شے کو محسوس نہیں کر پارہی تھی جسے وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کی ”وجہ“ جانتی تھی لیکن وہ اس وجہ کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی.....

اگلے چند ہفتوں میں اسے شیردل کی چھٹی بڑھ جانے کا پتا چل گیا تھا۔ وہ اب چھ ماہ کے لیے چھٹی پر چلا گیا تھا اور اس کی سپٹ پر کسی اور کو تعینات کر دیا گیا تھا۔ وہ اس سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرنے کے باوجود بے نیاز نہیں رہ سکی تھی..... بے چینی اور اضطراب میں اس نے ایک بار پھر اس سے رابطے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور ایک بار پھر نا کام رہی تھی۔ اس کے سیل فونز آف تھے اور یہ ایک تشویشناک بات تھی..... کوئی بھی مہینوں اپنے سیل فون آف نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے کسی بیچ میٹ سے رابطے میں نہیں تھا۔ اس نے چند بار اس کے والدین کے گھر پر خود فون کیا تھا لیکن ہر بار اسے یہی پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں ہے لیکن وہ کہاں ہے کب آئے گا اس کا اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ وہ دونوں اس سے پہلے بھی مہینوں ایک دوسرے سے رابطے میں نہیں رہتے تھے لیکن اس نے ایسا اضطراب اور وحشت کبھی محسوس نہیں کی تھی کیونکہ اسے شیردل کی خیر خبر ملتی رہتی تھی، وہ کہاں

تھا کیا کر رہا تھا پتا چل جاتا تھا لیکن اب جیسے وہ صفحہ ہستی سے ہی غائب ہو گیا تھا۔

تقریباً دو ماہ کے بعد بالآخر جیسے اس کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔ وہ اس دن بھی شیردل کے گھر کال کر رہی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح فون آپریٹر نے ہی اٹھایا تھا۔ وہ نیا آپریٹر تھا اور اس نے اس کا تعارف لینے کے بعد شیردل سے اس کی بات کروانے کے بجائے منترہ کے ساتھ لائن ملا دی تھی۔ وہ منترہ کی آواز سننے پر چند سیکنڈز عجیب گوگو کے عالم میں رہی جیسے طے نہ کر پا رہی ہو کہ اسے ان سے بات کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ ایک نیا پنڈورا باکس نہیں کھولنا چاہتی تھی۔

چند ہی منٹوں بعد اس کا فون بجنے لگا تھا۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا اور اس کا دل یک دم جیسے خوشی سے اچھلا تھا۔ وہ شیردل کے گھر کا نمبر تھا وہاں سے کال بیک ہو رہی تھی یقیناً آپریٹر نے شیردل کو اس کی کال کے بارے میں اطلاع دی تھی۔

اس نے بہت ایکساٹمنٹ کے عالم میں فون اٹھایا، آپریٹر نے اسے اطلاع دی تھی کہ منترہ اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ شش و پنج میں پڑی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ اُن سے بات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتی اس نے دوسری طرف سے ان کی آواز سن لی وہ اس بار اس کا نام لے کر اسے مخاطب کر رہی تھیں۔ یعنی وہ جانتی تھیں کہ وہ کس کو کال بیک کر رہی تھیں۔ اس نے بڑے محتاط سے انداز میں منترہ سے علیک سلیک کی۔

”میں شیردل کی خیریت دریافت کرنا چاہتی تھی۔ بہت دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی تھی کچھ آفیشل کام بھی تھا۔“ اس نے چھوٹے ہی منترہ کو بتایا اور ساتھ ہی جھوٹ بولنا بھی ضروری سمجھا۔

”شیردل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے اسے منترہ کی آواز بے حد بچھی ہوئی لگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اسے یک دم تشویش ہوئی۔

”نروس بریک ڈاؤن..... بہت زیادہ ڈپریشن ہے وہ..... ڈاکٹر نے ریٹ کے لیے کہا تھا..... بار بار بیمار ہو رہا ہے وہ؟“

عکس تشویش سے سنتی رہی۔

”آپ اس سے میری بات کروادیں۔“ اس نے اُن کی بات سننے کے بعد کہا۔ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے انہوں نے کہا۔

”میں نے شیردل سے کتنی بار کہا ہے کہ تم سے بات کرے یا مل لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کسی سے بھی بات نہیں کرتا..... کسی دوست سے نہیں ملتا۔ گھر سے نکلتا ہی نہیں۔ میں پورا ایک مہینہ اس کو ساتھ لے کے مری گزار کر آئی ہوں کہ کچھ بہتر ہو جائے گا لیکن چند دن ٹھیک رہتا ہے پھر دورے پڑنا شروع ہو جاتے ہیں تم اس سے ملنے کے لیے آؤ..... آکر سمجھاؤ اسے۔ تم سے تو بہت کلوز تھا۔“

عکس نے ان کی آواز میں اُتری بے بسی محسوس کی۔ وہ عام حالات میں کبھی اس سے مدد نہیں مانگ سکتی تھیں، کبھی اس سے یہ ساری گفتگو نہیں کر سکتی تھیں لیکن شیردل کی حالت نے منترہ کو جیسے عجیب خوف اور وسوسوں کا شکار کر دیا تھا۔

”میں آؤں گی اسے دیکھنے۔“ عکس نے ایک لمحے کے تذبذب کے بغیر کہا، کوئی دوسرا جواب اس کے پاس ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

عکس

اس نے وہاں جانے میں دیر نہیں کی تھی، وہ دوسرے دن آفس سے جلدی فارغ ہونے کے بعد لاہور میں آئی تھی۔ منترہ نے خلاف توقع بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ ان سے گفتگو کے دوران عکس کی پیشکش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ منترہ خود بھی شیر دل کی وجہ سے بہت زیادہ ڈپریشنڈ تھیں۔ شیر دل کی وجہ سے ان کی سب سے بڑی گریہاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ سائے کی طرح ہر وقت شیر دل کے ساتھ رہتی تھیں۔ انہوں نے شہینہ حسین کو اسی Phase سے اسی تکلیف دہ انداز میں گزرتے دیکھا تھا اور وہ اپنی اولاد کو ویسے انجام سے بچانے کے لیے ہلکان ہو رہی تھیں۔ وہ رعونت اور غرور یک دم جیسے کہیں اڑ گیا تھا جو منترہ بختیار کی پہچان تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران وہ کئی بار بات کرتے کرتے رو پڑی تھیں۔ شیر دل کی بیماری ان کے اپنے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی اور اس پر ان کی اپنی فیملی کا اس سارے مسئلے کے لئے انہیں مورد الزام ٹھہرانا اور وہ احساسِ جرم سے فرار کے لیے ڈوبنے کی طرح تنکے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ عکس مراد علی بھی ایسا ہی ایک تنکا تھا جس سے وہ اپنے بیٹے کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ان سے بات چیت کے دوران ہی عکس کو یہ پتا چلا کہ شیر بانو اور شیر دل کی طلاق ہو گئی تھی، دونوں فیملیز کے کچھ مشترکہ دوستوں اور رشتے داروں کی لاکھ کوششوں کے باوجود شہر بانو نے طلاق کے لیے کیس فائل کر دیا تھا۔ نکاح نامے میں طلاق کا حق اور بچے کی کسٹڈی کا حق پہلے ہی اسے تفویض کیے جا چکے تھے اس لیے کیس کیس کے حق میں ختم ہونے میں چند ہفتے لگے تھے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ منترہ سے یہ سب سنتی رہی۔

بچہ وہ ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا اور اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی عکس کا دل مزید بوجھل ہو گیا تھا۔ منترہ نے اس کی بیماری اور تکلیف کے بارے میں کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں اور کم و بیش پندرہ کلو وزن کی کمی کے بعد کوئی بھی اسے دیکھ کر صحت مند نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کے گھنے سیاہ بالوں میں اب جگہ جگہ سفید بال دکھ رہے تھے۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آرہی ہو۔“ اس نے اندر آتے ہی بڑے معمول کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود جواباً مسکرا نہیں سکی۔

”کیسے اطلاع دیتی، تم نے تو فون ہی بند کیے ہوئے ہیں سارے۔“ اس نے عکس کی اس بات کا جواب

نہیں دیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا سگریٹ کا پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے وہ خود اس کے ساتھ والے صوفے کے کونے میں بیٹھ گیا تھا۔

”تم لوگ باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں۔“ منترہ واضح طور پر انہیں اکیلے باتیں کرنے کا موقع دینا چاہتی تھیں۔

”میرا خیال ہے ہم لوگ باہر کا چکر لگا کر آتے ہیں، مجھے ایک دو کام بھی ہیں وہ بھی کر لوں گی۔“ عکس نے ایک دم اٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں ضرور بلکہ اچھا ہے شیردل بھی بہت دنوں سے باہر نہیں نکلا، اسی بہانے اس کی بھی تھوڑی آؤنگ ہو جائے گی۔“ منترہ نے ایک لمحے کا تامل بھی نہیں کیا تھا۔ شیردل نے حیران اور الجھی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا پھر جیسے بادل ناخواستہ وہ اٹھ گیا تھا۔

”کیا کام ہیں تمہیں؟“ اس نے گاڑی سڑک پر لاتے ہی عکس سے پوچھا تھا وہ گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔

”تمہیں میری کالز اور میسجز مل رہے تھے نا؟“ عکس نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

”ہاں۔“ شیردل نے کوئی بہانہ بنائے بغیر کہا۔

”اور تم نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”فائدہ کیا تھا؟“ وہ سڑک کو دیکھتے ہوئے عجیب بے بسی سے بولا۔

”تم نے حالت دیکھی ہے اپنی؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے عکس کی بات کا ٹی اور گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

”کیا ہوا؟“ عکس نے کچھ حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

”تم ڈرائیو کرو، میں مین روڈ پر ڈرائیو نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“

”میرا سر چکرانے لگتا ہے بہت ساری گاڑیاں اور ان کی اسپینڈ دیکھ کر دو دفعہ گاڑی مار چکا ہوں اور تم

guest ہو میں نہیں چاہتا تمہیں ایسبولینس کی ضرورت پڑے۔“ وہ بات کو خوش دلی سے کرنے کی کوشش کر رہا

تھا اور اس نے ساتھ ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ عکس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

”مین روڈ پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس کسی چھوٹے موٹے پارک میں چلو۔“

”شام ہو رہی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا تھا پھر دروازہ بند کر کے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اگلا موڑ مڑتے ہی بچوں کے ایک پلے ایریا کے سامنے اس نے گاڑی روک دی تھی۔

”آنٹی نے مجھے بتایا کہ تمہاری divorce..... پارک کی ایک بیچ پر آ کر بیٹھنے اور چند ادھر ادھر کی باتوں

کے بعد اس نے شیردل سے کہنے کی کوشش کی۔ شیردل نے اسے ٹوک دیا۔

”بس اب اس ایٹو کے بارے میں بات مت کرنا..... کوئی اور بات کرو۔“ وہ جیسے تکلیف میں کراہا تھا

یوں جیسے اس کے ہاتھ سے اس کا کوئی کھرنڈ کھر چا گیا تھا۔ عکس کا دل بُری طرح دکھا۔

”جواب پہ واپس کیوں نہیں آرہے؟“ اس نے بات بدل دی۔
 ”آ جاؤں گا۔“ اس نے اسی بیزاری سے کہا۔ وہ اب سگریٹ سلگا رہا تھا۔
 ”ٹینس کیسی چل رہی ہے تمہاری؟“ اسے پہلی بار شیردل کے لیے سوال ڈھونڈتے ہوئے دقت ہو رہی تھی۔
 ”چھوڑ دی۔“ وہ ایک کش لیتے ہوئے ایک جھولے پر جھولتی پچی کو دیکھنے لگا، عکس نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

”تم اتنے کمزور تو نہیں تھے شیردل۔“ عکس نے اس کی توجہ ہٹائی۔
 ”میں سوچ رہا تھا اب تک تمہاری شادی ہو چکی ہوگی..... کافی مہینے گزر چکے ہیں۔“ شیردل نے اس کے سوال کے جواب میں اس سے بات بدل کر کہا۔ ”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے، کیسا ہے جواد؟“
 ”اگر تم میرے بھی سوالوں کا جواب نہیں دو گے تو میں بھی نہیں دوں گی۔“
 ”یہ تو بہت اچھا ہے سوال جواب کر کے کیا کرنا ہے ہم نے..... ایسے ہی خاموش بیٹھتے ہیں۔“ وہ دوسرا سگریٹ نکالنے کے لیے پیک اٹھانے لگا جب عکس نے ہاتھ بڑھا کر اس سے پہلے پیک اٹھالیا۔
 ”مشکل وقت ہے لیکن گزر جائے گا شیردل۔“ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا پھر اس نے بیچ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں گزر جائے گا لیکن فی الحال نہیں گزر رہا۔“
 ”اس طرح گزارنے سے نہیں گزرے گا، تم چاب پرواپس آؤ۔“
 ”آ جاؤں گا، ساری زندگی گھر میں بیٹھ کے تو نہیں گزار سکتا میں۔“ اس نے بیزاری سے کہتے ہوئے عکس کے ہاتھ سے سگریٹ کا پیک لینے کی کوشش کی۔

”مجھے استھما ہے تم اگر پھر بھی میرے پاس بیٹھ کر اسموئنگ کرنا چاہتے ہو تو لو کرو۔“ عکس نے نرمی سے وہ پیک اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ جیسے کچھ دیر پیک ہاتھ میں لیے الجھتا رہا پھر اس نے پیک رکھتے ہوئے کہا۔
 ”تم جانتی تھیں میرے ساتھ کیا ہوا لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے کال کر کے میرا حال پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔“ وہ بالآخر اپنے دل کا غبار نکالنے لگا تھا۔

”مجھے بہت دیر سے پتا چلا کئی دن بعد۔“
 ”جھوٹ مت بولو۔“ شیردل نے اسے ٹوکا۔
 ”تمہارا ذاتی معاملہ تھا یہ اور میں کیسے.....“

”shut up“ شیردل نے اس بار پھر اس کی بات کاٹی۔
 ”تم اس وجہ سے خفا تھے مجھ سے؟“ عکس نے بالآخر ایک گہری سانس لے کر کہا۔
 ”تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا تھا..... تمہیں کم از کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔“
 ”میں نے تمہیں کالز اور میسج کیے تھے۔“

”کئی دن بعد آئے تھے وہ میسج۔“ اس نے پھر بات کاٹ کر کہا۔
 ”اور پھر کئی مہینے میں جو کالز اور میسج تمہیں کرتی رہی وہ.....“ وہ اب ایک دوسرے سے اسی طرح بات کرنے لگے تھے جیسے ہمیشہ کرتے تھے۔ وہ دقت، دشواری آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھی۔

”وہ اگلے ماہ شادی کر رہی ہے۔“ مدھم آواز میں کہے ہوئے جملے پر عکس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اسے اس ”وہ“ کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی کہ وہ بھی اگلے مہینے شادی کر رہی تھی۔

”کس سے؟“

”کزن ہے ایک اس کا..... داؤد۔“

”میں جانتی ہوں تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ہے یہ۔“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں، میرے لیے یہ سب تکلیف دہ نہیں ہے، مجھے اس عورت میں دلچسپی نہیں ہے اب..... لیکن میرے لیے تکلیف دہ بات صرف یہ ہے کہ میں مثال سے الگ ہوں میں اسے دیکھ نہیں پارہا، اس سے بات نہیں کر سکتا، مجھے اس کا خیال آتا ہے تو میں سو نہیں پاتا۔“ وہ بے بسی اور تکلیف سے کہہ رہا تھا۔

”وہ کب تک ایسا کر سکتی ہے..... ابھی غصے میں ہے..... تھوڑا تاؤ دواؤ..... چند مہینے..... پھر سب کچھ نارمل ہونا شروع ہو جائے گا، پھر وہ اپنی زندگی میں بڑی ہو جائے گی پھر اسے احساس ہو گا کہ وہ مثال کو ساری زندگی کے لیے تم سے دور نہیں رکھ سکتی۔“ عکس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”تب تک مثال مجھے بھول جائے گی۔“ شیردل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

”تم امریکا جا کر اس سے مل آؤ۔“

”میرا ویزا اینسل کر دیا ہے امریکن ایمبیسی نے..... شہر بانو نے میرے خلاف رپورٹ کی ہے کہ میرے امریکا آنے سے اسے اور مثال کو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔“ وہ تلخی سے ہنسا۔ عکس کچھ دیر بول نہیں سکی۔ وہ اب سمجھ پارہی تھی کہ اس کا اگر نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا تو بلاوجہ نہیں ہو گیا تھا، شہر بانو کی جذباتیت نے اسے دیوار سے لگا دیا تھا۔

”شہر بانو ایسی نہیں تھی۔ میں حیران ہوں اس نے.....“ شیردل نے اس کی بات کاٹ دی۔

”شہر بانو ایسی ہی تھی اور تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو۔ میں نے تمہیں بہت شروع میں بتا دیا تھا کہ وہ بہت جذباتی ہے۔ وہ بہت ناچختہ کار ہے، میری اور اس کی شخصیت میں بہت فرق ہے لیکن تم مجھے مجبور کرتی رہی تھیں۔ وہ کم عمر ہے اس لیے ایسی ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی صرف سپورٹ ملنے کی دیر ہے..... وہ تم سے پاگلوں جیسی محبت کرتی ہے تمہارے ساتھ رہے گی تو یہ چھوٹی موٹی خامیاں چلی جائیں گی۔ اس شادی میں تم نے مجھے پھنسا دیا۔.....“ وہ اس پر برسنے لگا تھا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ شہر بانو نے اس کے سارے اندازے اور توقعات غلط ثابت کر دی تھیں۔

☆☆☆

اس رات وہ بہت دیر سے واپس گھر پہنچی تھی۔ خیر دین ہمیشہ کی طرح اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی۔“

”جی نانا۔“

”کیا کام تھا لاہور میں؟“ وہ اس غیر متوقع سوال پر خیر دین کی شکل دیکھنے لگی۔ لاہور جانا اس کا معمول تھا اور خیر دین کبھی وہاں کام کی نوعیت اور اس کی مصروفیات کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔

”شیردل کی عیادت کے لیے گئی تھی، وہ بیمار ہے۔“ اس نے بھی یک دم جیسے خیر دین سے جھوٹ بولنے کا

تک کرتے ہوئے اسے صاف صاف بتایا۔

”کیا ہوا ہے؟“ خیر دین چونک گیا تھا۔

”کوئی مسئلہ ہے بہت زیادہ..... بہت کمزور ہو گیا ہے۔“ وہ مدہم آواز میں کہہ کر اندر چلی گئی۔ خیر دین

بہت کمزور رہا۔

اپنے بیڈروم میں آکر اس نے ابھی اپنا بیگ رکھا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے بیگ میں

سے سیل فون نکال کر اسے دیکھا، اس پر شیردل کا نام چمک رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”تم گھر پہنچ گئی ہو؟“ علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”ہاں، ابھی ابھی پہنچی ہوں۔“ وہ فون پر بات کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اپنے جوتے اتارنے لگی۔

”آج بہت دیر ہو گئی تمہیں لاہور سے نکلتے ہوئے، مجھے تمہارے جانے کے بعد وقت کا اندازہ ہوا اس

لیے فون کر کے پوچھ لیا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی کافی دیر سے لاہور سے نکلی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح بے مقصد

تک کرتے رہے۔ وہیں پارک میں بیٹھے پھر شیردل ایک قریبی ریستورنٹ میں اس کے منع کرنے کے باوجود

اسے کھانا کھلانے لے گیا۔ عکس کو اندازہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے مزید دیر ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

”اینڈ آئی ایم سوری۔“ وہ اس کے اگلے جملے پر حیران ہو گئی تھی۔

”یہ کس لیے؟“

”ابھی بیٹھ کے سوچ رہا تھا تو مجھے احساس ہوا تم سے بہت ساری الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں میں نے.....

جنس کہنی چاہیے تھیں جو کچھ ہوا اس میں تمہارا تو کوئی تصور نہیں تھا۔“ وہ اب کچھ تا دم سا کہہ رہا تھا۔

”لیکن آج کل بس اسی طرح کی باتیں کرتا پھر رہا ہوں کچھ سمجھ نہیں آتا کون سی بات کس سے کہنی چاہیے

کس سے نہیں۔ صرف اس لیے میں کسی سے بھی بات نہیں کر رہا۔“ وہ جیسے بڑی بے بسی کے عالم میں اس سے

مشاورت مندرگی کا اظہار کر رہا تھا۔

”تم مجھ سے تو بات کر سکتے ہو اس بات کی پروا کیے بغیر کہ کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر دو..... ساری عمر تم نے

اس بات کی پروا نہیں کی تو اب تمہیں یک دم گفتگو کے آداب کیسے یاد آ گئے؟“ شیردل اس کی بات پر ہولے

سے ہنس پڑا۔ وہ اس کا طنز سمجھ گیا تھا۔

”نہیں، اتنی الٹی سیدھی باتیں بھی نہیں کی ہیں تم سے..... صرف تمہیں الٹی سیدھی لگتی رہی ہیں۔“

”اسی لیے کہہ رہی ہوں مجھ سے بات کر سکتے ہو تم..... تمہاری الٹی سیدھی باتوں کو ایک کان سے سن کر

دوسرے کان سے نکالنے میں مہارت ہے مجھے۔“ وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

”اچھا چلو بس میں نے یہی پوچھا تھا پھر بات کریں گے۔“ شیردل نے یکدم بڑے abrupt انداز

میں فون بند کر دیا تھا۔

وہ فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔ وہ clinically depressed تھا اور اسے شیردل کو اس طرح دیکھ کر

بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً پانچ گھنٹے اکٹھے بیٹھے رہے تھے اور وہ تقریباً چار گھنٹے مثال کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس

کا ہر دوسرا جملہ اس بات پر ختم ہو رہا تھا۔ ”شہر بانو میرے ساتھ اس طرح کیسے کر سکتی ہے.....“ What have

I done to deserve all this (میں نے ایسا کیا برا کیا ہے جس کی سزا مجھے ملے)

اور اس ایک سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن ہر بار اس کا یہ جملہ عکس کو عجیب سے احساس جرم کا شکار کر دیتا تھا شیردل کی زندگی کے اس میس کا آغاز اس کی کوششوں سے ہوا تھا جو اس نے اپنی زندگی کے میس کو صاف کرنے کے لیے کی تھیں کہیں نہ کہیں وہی اس سارے مسئلے اور خرابی کی ذمے دار تھی اور وہ اس حقیقت سے نظریں نہیں چڑا رہی تھی۔ شیردل کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ جاتی پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کرتی کہ اس کے کسی اقدام سے کسی دوسرے کی زندگی پر کیا اثر پڑا تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب خود وہ کبھی اس طرح ایسی کسی فیملی کے ہاتھوں مسائل کا شکار ہو چکی ہوتی..... لیکن یہاں سارا فرق اس کے لیے شیردل ڈال رہا تھا۔ ضمیر کی یہ ساری چیخیں اسے اس ایک شخص کی وجہ سے ہو رہی تھیں۔ جسے وہ بری طرح چاہتی تھی اور جسے وہ کبھی تکلیف میں نہ دیکھنے کی خواہش کے باوجود تکلیف میں دیکھ رہی تھی۔

شیردل نے اس سے شہر بانو کے اس کے ساتھ فیئر کے حوالے سے کوئی الزام نہیں دہرایا تھا وہ بھی اس کو یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی ان کے بریک اپ کی وجہ کون سے الزامات بنے تھے۔ اس رات عکس مراد علی سو نہیں سکی تھی۔ زندگی میں بہت سے درست سمجھے جانے والے فیصلے بہت غلط نتائج لے کر آتے ہیں اس کیس کو فائل کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے عکس نے اسے بہت درست اور ضروری سمجھا تھا لیکن اس رات بیٹھ کر اس نے پہلی بار بہت غیر جانب داری اور حقیقت پسندی سے اس کیس کو فائل کرنے کے فیصلے پر دوبارہ غور کیا تھا بہت ساری زندگیاں متاثر ہوئی تھیں اور کس حد تک متاثر ہوئی تھیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ فائدہ کیا ہوا تھا؟..... صرف ایک..... خیر دین پر سے وہ الزام ہٹ گیا تھا جس کی اب اسے پروا تک نہیں تھی جس کو کوئی یاد تک نہیں رکھے ہوئے تھا سوائے چڑیا کے..... کیونکہ وہ اس کے بچپن کا ناقابل فراموش زخم تھا۔ ”ان جنگوں کو لڑنا بے وقوفی ہوتی ہے چڑیا جن میں ہونے والی جیت بھی ہماری زندگی کے لیے ضروری نہ ہو۔“ اسے خیر دین کی بات یاد آئی تھی۔ اپنے ماضی کی تباہی کو ٹھیک کرنے کی کوشش میں اس نے کسی دوسرے کا مستقبل تباہ کر دیا تھا..... جو بھی کچھ ہوا تھا جان بوجھ کر نہیں ہوا تھا لیکن ہو گیا تھا۔

وہ ساری رات اپنے کمرے میں ٹھہرتی رہی تھی، صبح ناشتے کی میز پر خیر دین نے اس کی سرخ سوجی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے چڑیا؟“ انہیں تشویش ہوئی۔

”جی ٹھیک ہے۔“ اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ وہ جانتی تھی خیر دین اس سے شیردل کے بارے میں پوچھے..... کوئی بات کرے..... خیر دین نے جو کہا تھا اس نے عکس مراد علی کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

”تم سے ایک بات میں نے بھی چھپائی تھی چڑیا..... بہت بار بتانا چاہا لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر سکا۔“ وہ خیر دین کے جملے پر حیران رہ گئی تھی۔ اسے ایک دم کون سا راز شہر کرنا یاد آیا تھا۔ اس وقت تو وہ کچھ اور بات کر رہے تھے۔ ”کون سا راز ہے نانا! جو آپ نے کبھی مجھے نہیں بتایا؟“ خیر دین چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”شہر بانو کی ماں کئی سال پہلے ایک بار مجھ سے ملنے آئی تھی۔“

”میں جانتی ہوں نانا، آپ نے مجھے بتایا تھا۔“ عکس نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں لیکن میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ.....“ وہ بات کرتے کرتے رکا اور اس کے اگلے جملے نے ڈاکٹر

عکس مراد علی کو مٹی کر کے رکھ دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)